ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

اسوۂ ابراہیمی
—— سید جلال الدین عمری ——

تفسیر منہج الصادقین — ایک مطالعہ
—— پروفیسر کبیر احمد جائسی ——

علوم اسلامیہ کی اشاعت میں ہندوستانی مدارس کا کردار
—— ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی ——

صحابیات اور علم کی تحصیل واشاعت
—— ڈاکٹر زاہدہ شبنم ——

قرآن کریم کا سائنسی اعجاز
—— ڈاکٹر محمد عبدالتواب حامد ——

تفسیر ماثور وتفسیر غیر ماثور پر ایک نظر
—— پروفیسر احتشام احمد ندوی ——

جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف
تعارف وتبصرہ
—— مولانا محمد جرجیس کریمی ——
—— ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ——

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اکتوبر ——— دسمبر ۲۰۱۰ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93, ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۲۹ ——— شمارہ:۴

شوال ——— ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ

اکتوبر ——— دسمبر ۲۰۱۰ء

تحقیقاتِ اسلامی کے قدیم شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09760248489

ای میل : tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09412562972

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسوۂ ابراہیمی — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

تفسیر 'منہج الصادقین' ایک مطالعہ (۲) — پروفیسر کبیر احمد جائسی — ۱۷

علوم اسلامیہ کی اشاعت میں ہندوستانی مدارس کا کردار — ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی — ۳۱

بحث ونظر

صحابیات اور علم کی تحصیل واشاعت — ڈاکٹر زاہدہ شبنم — ۵۷

ترجمہ وتلخیص

قرآن کریم کا سائنسی اعجاز — ڈاکٹر محمد عبدالتواب حامد — ۷۷

مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

نقد واستدراک

تفسیر ماثور اور تفسیر غیر ماثور پر ایک نظر — پروفیسر احتشام احمد ندوی — ۱۰۱

جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف — ۱۰۵

تعارف وتبصرہ

اکلوتا فرزند ذبیح، اسحاقؑ یا اسماعیلؑ؟ — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۰۹

حدیث اور اس کے اصول وضوابط — ،، ،، — ۱۱۰

مطالعات ومشاہدات — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۱

ذکر شہباز — ،، ،، — ۱۱۲

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۳۷) — ۱۱۵

فہرست مضامین ومضمون نگاران تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ، جلد ۲۹، ۲۰۱۰ء — ۱۱۷

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی

ساجدہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ (سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۲۔ ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

جمال پور، علی گڑھ (shami makhtarqasmi@gmail.com)

۳۔ ڈاکٹر زاہدہ شبنم

لیکچرر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، لاہور کالج (ویمن) یونی ورسٹی، لاہور (پاکستان)

۴۔ ڈاکٹر محمد عبدالتواب حامد

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ تفسیر وعلوم القرآن، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، (پاکستان)

۵۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۶۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی

مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ (سابق صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونی ورسٹی (کیرلا)

۷۔ جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف

پوسٹ بکس نمبر: ۱۶۱۰۰، صنعاء، یمن

۸۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۹۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

اسوۂ ابراہیمی

سید جلال الدین عمری

مدیر محترم مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی ہر سال مسجد اشاعت اسلام (مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی) میں عیدین کے خطبے دیتے ہیں، جنھیں سننے کے لیے لوگ قریب اور دور سے بہت بڑی تعداد میں تشریف لاتے ہیں۔ گزشتہ سالوں میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر دیے گئے بعض خطبات کے منتخب حصے یہاں مرتب کر کے پیش کیے جارہے ہیں۔ (معاون مدیر)

قرآن مجید میں پیغمبروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ تذکرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آیا ہے۔ مختلف پہلوؤں سے ان کی بڑائی اور عظمت، ان کی دعوت وتبلیغ اور ان کے دلائل، ان کی سعی وجہد اور ان کی قربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی حیاتِ طیبہ کے چار پہلوؤں کو قرآن نے خوب نمایاں کیا ہے۔

۱۔ حنیفیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خصوصیت قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ توحید خالص کے علم بردار تھے۔ ہر شائبۂ شرک سے ان کا دامن پاک تھا۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں ان کا باپ خود شرک کا علم بردار اور پروہت تھا اور پوری ریاست اور پورا علاقہ شرک میں مبتلا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو مختلف پہلوؤں سے سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کو تنہا چلانے والا ہے، اس کے ساتھ کوئی

شریک نہیں ہے۔ اگر آدمی اس کے ساتھ شرک کرتا ہے تو اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ ایک رات حضرت ابراہیمؑ نے ایک ستارہ دیکھا۔ ستارے تو وہ ہمیشہ دیکھتے ہی تھے، لیکن غالباً وہ ایسا ستارہ تھا جس کی ان کی قوم پرستش کرتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم ستارہ پرست تھی اور اس کے نام سے اس نے بت بھی بنا رکھے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ انھوں نے ستارہ دیکھا تو اپنی قوم سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی میرا رب ہے۔ ظاہر ہے، حضرت ابراہیمؑ کبھی شرک میں مبتلا نہیں ہوئے، لیکن مشرک قوم کو سمجھانے کے لیے انھوں نے کہا کہ تم جس کی پوجا کرتے ہو، شاید وہی میرا بھی رب ہے، پھر جب ستارہ ڈوب گیا تو کہا: لاَ اُحِبُّ الآفِلِیْنَ ۔ (میں ڈوبنے والوں سے محبت نہیں کرتا) یعنی یہ خدا نہیں ہوسکتا اور میں اس کی پرستش نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ خدا تو وہ ہے جو اس کو روشنی عطا کرتا ہے اور اس کی روشنی ختم بھی کر دیتا ہے۔ خدا تو وہ ہوگا جس پر کسی کا حکم نہ چلے، یہاں تو صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس پر کسی دوسرے کا حکم چل رہا ہے، پھر وہ کیسے خدا ہوسکتا ہے؟ اور کیسے میں اپنا دل اس سے جوڑ سکتا ہوں؟ پھر اس کے بعد کسی وقت انھوں نے چاند کی طرف اشارہ کیا۔ ہوسکتا ہے وہ چودھویں رات کا چاند رہا ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ یہ زمین کو روشن کر رہا ہے، کوئی ستارہ اس کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔ یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو انھوں نے کہا کہ اگر میرا رب مجھے سیدھا راستہ نہ دکھائے تو میں بھٹک جاؤں گا۔ میرا رب تو کوئی اور ہے۔ میں چاند کو رب نہیں مان سکتا۔ اس لیے کہ کس شان کے ساتھ یہ طلوع ہوا، مگر کچھ دیر کے بعد غروب ہوگیا۔ پھر بعد میں کسی وقت انھوں نے اپنی قوم کو سمجھانا چاہا تو سورج کو دیکھ کر کہا کہ یہ ہے خدا۔ سورج دیوتا کی وہاں پہلے سے پرستش ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا: یہ سب سے بڑا خدا ہے، اس کی روشنی کے سامنے ہر روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ مگر جب شام کو وہ بھی غروب ہوگیا تو انھوں نے کہا کہ اس پر بھی کسی کا حکم چل رہا ہے، یہ بھی کسی کے حکم کا پابند ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری دنیا کو روشن کر رہا ہے، ساری دنیا اس سے فیض اٹھا رہی ہے، واقعی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور اس کے سامنے

سب کی روشنی ختم ہوجاتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ بھی کسی کے حکم کا پابند ہے، اس کے بعد انھوں نے کہا:

إِنِّـیْ وَجَّهْـتُ وَجْهِـیَ لِـلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِیْفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (الانعام:۷۹)	میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف کرلیا ہے جو زمین و آسمان کی خالق ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یہ ستارے اور سیارے جن کو تم خدا سمجھ رہے ہو، ان کا بھی خالق اللہ ہی ہے۔ وہی زمین اور آسمانوں کا بھی خالق ہے، اس کی طرف میں متوجہ ہوگیا ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی اور کو خدا مانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے تو غلط کرتا ہے، اس لیے میرا رخ تو صرف اس کی طرف ہوگیا ہے اور اس معاملے میں ، میں بالکل یکسو ہوں۔ اس معاملے میں میرے اندر کوئی کمزوری نہ دیکھوگے کہ کبھی کسی اور کو خدا مان لوں، یا کسی اور کی محبت میرے دل میں گھر کر جائے، یا کسی دوسرے کی پرستش کرنے لگوں۔ نہیں۔ میں بالکل حنیف ہوں، یکسو ہوں، جب کہ تم سب لوگ شرک میں مبتلا ہو۔ تم نے ایک خدا کی جگہ ہزاروں خدا بنا رکھے ہیں، اس لیے میں تم سے الگ ہو رہا ہوں۔ جن کو تم پوجتے ہو ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ذرا سوچیے ، ایک ایسی قوم میں جو ستارہ پرست ہے، ستاروں، سیاروں، چاند اور سورج کو خدا مان رہی ہے، ان کے بُت بنا رہی ہے اور ان کی پوجا کر رہی ہے، ایک شخص تن تنہا اس کے درمیان کھڑے ہوکر اعلان کر رہا ہے کہ یہ ستارے، یہ چاند، یہ سورج، کیا یہ سب خدا ہو سکتے ہیں؟ ان پر تو کسی اور کی حکومت ہے! میں تمھارے خداؤں سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شرک سے بے زار اور توحید کے علم بردار تھے۔ ہر جگہ انھوں نے کہا کہ دیکھو، خدا ایک ہی ہے، اسی کی عبادت ہونی چاہیے، اس کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کی آدمی عبادت کرے، جس کے آگے سر جھکائے اور جسے خدائی کا مقام عطا کرے۔

۲- سراپا اطاعت

دوسری خصوصیت حضرت ابراہیمؑ کی یہ بتائی گئی کہ وہ اللہ کے فرماں بردار تھے، وہ خدا کو صرف مان ہی نہیں رہے تھے، بلکہ اس کے آگے جھک گئے تھے اور اس کے ہر حکم کو ماننے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ قرآن ان کی یہ خصوصیت بتاتا ہے کہ وہ صرف زبانی دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ میں مشرک نہیں ہوں، موحّد ہوں، خدا کو ایک مانتا ہوں، بلکہ اس کے ہر حکم پر جھکنے والے تھے، کہا:

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرۃ:۱۳۱)

اس کے رب نے اس سے کہا: جھک جاؤ، چنانچہ (بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تردد کے) اس نے کہا کہ: میں جھک گیا اللہ رب العالمین کے سامنے۔

یہ ہے دین کی روح اور اس کی جان کہ اللہ کے حکم کے سامنے آدمی اپنا سر جھکا دے اور اپنی پیشانی ٹیک دے۔ اس کا رب جس کام کا حکم دے اس کے کرنے پر آمادہ ہو جائے اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہے۔

اب آگے دیکھیے کہ اللہ کے حکم سے خانۂ کعبہ کی تعمیر ہو رہی ہے، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اس کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔ بہت بڑا کام انجام پا رہا ہے۔ ساری دنیا کے لیے یہ توحید کا مرکز بننے والا ہے۔ اس تصور ہی سے آدمی کا سر اونچا ہو جائے گا کہ خدا نے ہمیں کتنا بلند مقام عطا کیا ہے کہ ہم جس گھر کی تعمیر کر رہے ہیں وہ ساری دنیا کے لیے توحید کا مرکز بن جائے گا! لیکن تعمیر کرنے والوں میں غرور اور بڑائی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وہ یہ دعا کر رہے ہیں:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ. (البقرۃ:۱۲۷-۱۲۸)

اے اللہ ہماری یہ دعا قبول فرمالے تو سننے اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنالے اور ہماری جو اولاد آگے آئے، اس میں بھی ایک امت مسلمہ برپا کر دے۔

یہ فرماں برداری کیا ہے؟ یہی اسلام ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے بیٹے کے حلق پر چھری پھیرنے کے لیے تیار ہوگئے تو اس موقع پر قرآن میں ان کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے وہ یہ تھے: ''فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ'' (باپ بیٹے جب جھک گئے اللہ کے حکم کے سامنے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹادیا) باپ نے کہا: بیٹے! مجھے اللہ کی طرف سے یہ اشارہ مل رہا ہے کہ اس کی راہ میں تمھیں ذبح کردوں، بیٹے نے کہا: اللہ کا حکم ہے تو اس پر عمل کیجیے، میں گھبراؤں گا نہیں، اللہ کا حکم ہے تو ٹھیک ہے، چنانچہ باپ بیٹے دونوں تیار ہوگئے۔ باپ کا چھری پھیرنے کے لیے تیار ہوجانا اور بیٹے کا پیشانی کے بل لیٹ جانا، قرآن نے اس کو 'اَسْلَمَا' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی دونوں ہمارے حکم کے آگے جھک گئے۔ یہ ہے اسلام!

۳- دعوتی جدوجہد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری خصوصیت ان کی دعوتی تگ ودو اور جدّوجہد ہے۔ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد انھوں نے اپنے باپ کو بڑی دل سوزی، محبت اور ملائمت کے ساتھ سمجھانے اور راہ حق پر لانے کی کوشش کی۔ اپنی قوم کے سامنے بھی بار بار مختلف انداز سے دعوتِ توحید پیش کی اور شرک کی غیر معقولیت واضح کی۔ وہ عراق سے شام، فلسطین، حجاز جہاں بھی پہنچے، اسی دعوت کو لے کر پہنچے۔ قرآن نے مختلف انبیاء کی جو دعوتی سرگزشت بیان کی ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ بہت نمایاں ہے۔ اس میں راہِ دعوت میں کام کرنے والوں کے لیے عبرت ونصیحت کے بہت سے پہلو ہیں۔

۴- قربانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چوتھی خصوصیت اپنے مقصد کے لیے ان کی قربانیاں ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ قربانی کا تصور ابھرتا ہے۔ ان کی زندگی سراسر قربانی کی زندگی تھی۔ انھوں نے اللہ کے لیے قربانی دی تھی۔ قربانی یوں تو بہت سے لوگ دیتے ہیں، بعض محض اپنے فائدے کے لیے اور بعض بیوی بچوں کے فائدے کے لیے، اس

کے علاوہ دیگر فائدے بھی پیش نظر ہوتے ہیں، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے جو قربانی دی تھی وہ صرف اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے تھی، اس کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے وہ ستارہ پرست قوم تھی، وہ سورج، چاند اور ستاروں سیاروں کی پرستش کرتی تھی۔ اس نے ان کے بت بنا رکھے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس گھرانے میں پیدا ہوئے، اس میں ان کا باپ اس وقت کا پنڈت اور مہنت تھا۔ وہ چاہتے تو بڑے اطمینان کی زندگی گزار سکتے تھے، لیکن انھوں نے باپ اور قوم کی مخالفت مول لی اور کہا کہ جن چیزوں کو تم لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے وہ حقیقت میں خدا نہیں ہیں، خدا تو کوئی اور ہے۔ گھر کی مخالفت آسان نہیں ہے۔ قرآن مجید نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس بات پر ان کے باپ سے ان کی مخالفت ہوئی تھی۔ انھوں نے باپ سے کہا تھا:

یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَاءَ نِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْ أَهْدِکَ صِرَاطاً سَوِیّاً۔ (مریم:۴۳)	اباجان! جو علم میرے پاس آیا ہے وہ آپ کے پاس نہیں ہے آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: تم لوگ یہ کس کی پوجا کر رہے ہو؟ میرا راستہ دوسرا ہے۔ تمھارے عقیدے، تمھارے مذہب اور تمھارے طریقۂ عبادت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ تم شرک میں مبتلا ہو، جب کہ میں توحید کا علم بردار ہوں:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِیْفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (الانعام:۷۹)	میں سب سے کٹ کر اس ذات کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان سے قوم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس

نے کہا: ابراہیمؑ کو یہ اعلان کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ اس کی سزا یہ ہے کہ الاؤ تیار کرو، آگ دہکاؤ اور اس میں ڈال کر اسے زندہ جلاڈالو۔ وہ انھیں قتل بھی کرسکتے تھے، سنگ سار بھی کرسکتے تھے، لیکن انھوں نے سوچا کہ اسے ایسی سزا دو کہ بعد کے لوگوں کے لیے عبرت بن جائے، چنانچہ یہی ہوا، آگ دہکائی گئی اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینک دیا گیا۔ لیکن اس وقت اللہ کی شان کریمی جوش میں آئی اور آگ ٹھنڈی ہوگئی:

قُلْنَا يٰنَارُ كُونِيْ بَرْداً وَّسَلَاماً عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ. وَأَرَادُوا بِهٖ كَيْداً فَجَعَلْنٰهُمُ الْأَخْسَرِيْنَ (الانبیاء:۶۹-۷۰)

ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے۔ انھوں نے اس کے خلاف خفیہ تدبیر کی، لیکن ہم نے انہیں نیچا دکھا دیا۔

دشمنوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ ناکام و مراد رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے بچالیا، اس لیے کہ ان سے ابھی اور کام لینے تھے۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وطن سے ہجرت کا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے کہا کہ اب میں یہاں سے جارہا ہوں۔ اللہ مجھے جہاں پہنچانا چاہے گا، پہنچائے گا۔ اس موقع پر وہ دعا کرتے ہیں:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصّٰفّٰت:۱۰۰) اے اللہ! مجھے صالح اولاد دے۔

آدمی اولاد کے لیے دعا کرتا ہی ہے۔ جن کی اولاد نہیں ہوتی وہ رات دن دعائیں کرتے ہیں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کی دعا بس یہی نہیں تھی کہ اے اللہ! مجھے اولاد دے، بلکہ انھوں نے صالح اولاد کی دعا کی۔ اس لیے کہ اگر اولاد صالح نہیں تو بے کار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ فرمایا:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ (الصّٰفّٰت:۱۰۱) ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

یہ بچہ بڑا ہوا اور دوڑ دھوپ کے قابل ہوا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اس جگر گوشے کو ذبح کررہے ہیں۔ اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ ارے خواب ہی تو ہے، اس کا کیا اعتبار؟ آدمی سوچ بھی نہیں سکتا

کہ وہ اپنی اولاد کو ذبح کرسکتا ہے ۔لیکن حضرت ابراہیمؑ نے خواب کو اشارۂ الٰہی سمجھا۔ انھوں نے بیٹے سے کہا: بیٹے ! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں، تمھاری رائے کیا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جواب دیتے ہیں:

یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (الصّٰفت :۱۰۲)

ابّا جان ! آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے اسے کرگزریے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

اب باپ بیٹے دونوں اللہ کے حکم پر جھک گئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بَل لٹادیا۔اس پر اللہ نے کہا: تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔اب اس کے عوض ایک مینڈھا ذبح کردو۔ کہا جاتا ہے کہ مینڈھا جنت سے آیا تھا، یا اسی جنگل میں اچانک انھیں مل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو، بہرحال پہلے سے وہاں کوئی مینڈھا نہیں تھا، آزمائش پوری ہونے کے بعد ایک مینڈھا فراہم کردیا گیا اور کہا گیا کہ اسے ذبح کردو اور اسی جذبہ سے ذبح کرو کہ حکم ہوگا تو بیٹے کے گلے پر چُھری پھیردو گے۔قرآن نے کہا:

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ (الصّٰفت :۱۰۸)

یہ سنت ہم نے بعد میں جاری کردی۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں دوسری جگہ کہا ہے:

وَإِذِ ابْتَلَىٰٓ إِبْرَاهِيْمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً (البقرۃ:۱۲۴)

ابراہیمؑ کو اس کے رب نے بعض باتوں میں آزمایا (امتحان لیا)، اس پر وہ پورا اُترا تو اُس کے رب نے کہا: ہم تمھیں دنیا کے لیے امام بنارہے ہیں۔

یعنی ہم تمھیں دنیا کے لیے نمونہ بنارہے ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ دین کے لیے کیا کیا تکلیفیں برداشت کی جاسکتی ہیں؟ کیا کیا قربانیاں دی جاسکتی ہیں؟ گھر کی، وطن کی، اولاد کی، بیٹے کو ذبح کرنے کی۔ اگر کوئی شخص دیکھنا چاہے تو دیکھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو۔ وہ دینی لحاظ سے امام تھے اور پھر ان کی ذرّیت میں دنیا کا اقتدار بھی آیا۔

اللہ نے ان کی اولاد میں پیغمبروں کا سلسلہ چلایا، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ اور خدا جانے کتنے پیغمبر آئے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ آئے، پھر آخر میں حضرت محمد ﷺ تشریف لائے۔ یہ انعام آپ کو دیا گیا کہ دنیا کے لیے آپ کو نمونہ بنا دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ دنیا میں آدمی قربانیوں سے امام بنتا ہے، وہ شخص دنیا کا امام، قائد اور لیڈر ہے جو دین کے لیے قربانی دے، کسی اور مقصد سے نہیں، صرف اللہ کے دین کے لیے۔ وہ دنیا کو دکھا دے کہ اللہ کے دین کے لیے کس کس چیز کی قربانی دی جا سکتی ہے؟ جان بھی دی جا سکتی ہے، آگ کے دریا سے بھی گزرا جا سکتا ہے، اولاد بھی قربان کی جا سکتی ہے، وطن بھی چھوڑا جا سکتا ہے، غرض ہر چیز کی قربانی دی جا سکتی ہے، تب ہی امامت کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی امام خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ تھے۔ آپ کو ساری دنیا کی امامت دی گئی اور اُن ساری آزمائشوں سے آپ کو گزارا گیا جس کا آدمی تصور کر سکتا ہے۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

لقد اوذیت فی اللہ لم یؤذ احد.[1] مجھے دین کے راستے میں اتنی تکلیفیں پہنچیں کہ کسی دوسرے کو نہیں پہنچی ہوں گی۔

اس کے بعد کہا گیا کہ آپؐ دنیا کے قائد اور رہ نما ہیں، اُسوہ اور نمونہ ہیں۔ دنیا آپؐ کے ذریعہ دیکھ سکتی ہے کہ اللہ کے دین پر کس طرح عمل ہوتا ہے اور اس کے لیے کس طرح قربانیاں دی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں امتِ مسلمہ کھڑی ہوئی۔ اس نے بھی وہ تمام قربانیاں دیں جن کی ضرورت دین کو پیش آئی، جان کی، مال کی، وطن کی، اور دیگر قربانیاں۔ اس کے بعد اس سے کہا گیا کہ تم دنیا کے امام ہو:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰) تم بہترین امت ہو، تمھیں لوگوں کی رہ نمائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

جب تک یہ امت اللہ کے دین کے لیے قربانیاں دیتی رہی وہ دنیا میں غالب

---

[1] جامع ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، ۲۴۷۲

رہی، لیکن جب سے اس نے دین کے لیے قربانی دینا چھوڑ دیا وہ ذلت اور پستی میں مبتلا ہوگئی۔ اللہ نے کہا کہ اب یہ امت امامت کی اہل نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! تو مجھے امام بنا رہا ہے، میری اولاد کو بھی امام بنا۔ اس وقت بھی اللہ نے فرمایا تھا:

لاَ یَنَالُ عَھْدِیْ الظّٰلِمِیْنَ (البقرۃ:۱۲۴) میرا وعدہ ظالموں سے نہیں ہے۔

اس امت کو قیادت کا مقام دیا گیا تھا اور اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

انتم شھداء اللہ فی الأرض [1] تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔

یعنی جسے تم کہو گے کہ یہ راہِ راست پر چل رہا ہے، یقیناً وہ راہِ راست پر چل رہا ہے اور جسے تم کہو گے کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے تو یقیناً وہ غلط راستے پر ہے۔ تم جس کے بارے میں جو فیصلہ کرو گے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوگا۔

جب اُمت نے قربانی دینی ختم کر دی تو وہ امامت و قیادت سے محروم ہوگئی۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ آدمی ہر کام کے لیے قربانی دے سکتا ہے، قومیں قربانی دے رہی ہیں، جماعتیں قربانی دے رہی ہیں، لیکن اللہ کے دین کے لیے قربانی دینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ ایسے افراد کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی ہیں جو اللہ کے دین کے لیے قربانی دیں۔ وقت کی، صلاحیت کی، مال کی، توانائی کی، جو اللہ کے دین کے غلبہ و سربلندی کے لیے اپنی صلاحیتیں لگا دیں۔ اللہ نے تو وعدہ کیا ہے کہ آزمائشوں اور قربانیوں کے بعد وہ افراد اور اقوام کو امامت کے مقام پر پہنچاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں— اور کون ہے جو نہیں چاہتا— کہ آپ کو پھر دنیا میں امامت کا مقام حاصل ہو، آپ آگے ہوں اور دنیا آپ کے پیچھے چلے، آپ رہ نما ہوں اور دنیا آپ سے رہ نمائی حاصل کرے، تو ضروری ہے کہ آپ نمونہ پیش کریں قربانی کا، اللہ کے دین کے لیے جینے اور مرنے کا۔ یہی سبق نبی ﷺ کو بھی دیا گیا تھا۔ آپؐ سے کہا گیا تھا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، ۱۳۶۷؛ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، ۲۲۰۰

قُلْ إِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْٓ إِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْناً قِیَماً مِّلَّةَ إِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفاً وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (الانعام:۱۶۱)

اے پیغمبر ﷺ، آپ یہ اعلان کر دیجیے کہ میرے رب نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ سیدھا دین، وہ دین جسے ابراہیم نے اختیار کیا تھا، اس ابراہیم نے جو ساری دنیا سے کٹ کر اللہ کے لیے یکسو ہو گیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

آپؐ سے کہا گیا تھا کہ اعلان کر دیں:

قُلْ إِنَّ صَلاَتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لاَ شَرِیْکَ لَهُ وَبِذٰلِکَ أُمِرْتُ وَأَنَاْ أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام:۱۶۲-۱۶۳)

کہو میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس کے آگے سر جھکا رہا ہوں۔

جو شخص حقیقی معنٰی میں قائد اور رہ نما ہو اُسے چاہیے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ اگر قربانی کی بات کرتے ہو تو دیکھو میں سب سے پہلے قربانی دینے والا ہوں۔ ہر پیغمبر یہی کہہ کر دنیا کے سامنے آتا ہے:

وَأَنَاْ أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام:۱۶۳)

میں سب سے پہلے اللہ کے سامنے اپنا سر جھکانے والا ہوں۔

اللہ کی رحمت، اس کی عنایت اور اس کے وعدے ہمارے منتظر ہیں، لیکن اس نے یہ شرط لگا دی ہے کہ ہم کو امامت و قیادت اس وقت حاصل ہوگی جب ہم اس کے دین کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

☆☆☆

کارکنانِ ادارۂ تحقیق کی بعض تصانیف

جو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوئیں

۱-	مومنانہ زندگی کے اوصاف	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۰/-
۲-	اسلام اور آزادئ فکر و عمل	،،	۳۵/-
۳-	کم سنی کی شادی اور اسلام	،،	۷/-
۴-	بچوں کی مزدوری اور اسلام	،،	۵/-
۵-	بندھوا مزدوری اور اسلام	،،	۳/-
۶-	دعوت دین کے علمی تقاضے (ترجمہ)	،،	۴۰/-
۷-	قرآن اور سائنس (ترجمہ)	،،	۲۰/-
۸-	انسانی معاشرہ اسلام کے سایے میں (ترجمہ)	،،	۲۰/-
۹-	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۰/-
۱۰-	حقائق اسلام- بعض اعتراضات کا جائزہ	،،	۵۰/-
۱۱-	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	،،	۲۰/-
۱۲-	قرآن کریم کا اعجاز بیان (ترجمہ)	،،	۷۵/-
۱۳-	سیرت رسول- دروس اور نصائح (ترجمہ)	،،	۱۶۰/-
۱۴-	عہد نبوی کا مدنی معاشرہ (ترجمہ)	،،	۱۶۰/-
۱۵-	اسلام اور مغرب کی کش مکش (ترجمہ)	،،	۷۵/-
۱۶-	علم تفسیر- چند بنیادی مسائل (ترجمہ)	،،	۴/-
۱۷-	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۸۵/-
۱۸-	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	،،	۳۵/-

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تفسیر 'منہج الصادقین فی الزام المخالفین' ایک مطالعہ

(۲)

پروفیسر کبیر احمد جائسی

فقہ جعفری میں 'تقیہ' کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اِس کی ضرورت، دین میں اِس کا مقام، اِس کی تعبیر، توجیہ اور تفصیل پر دوازدہ امامی علما، فقہ جعفری کی تدوین کے بعد ہی سے آج تک برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں۔ یہاں پر میں شیعہ سُنی اختلاف پر کوئی گفتگو نہیں کروں گا، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ سنیوں کی فقہ میں تقیہ پر کوئی بحث و مباحثہ نہیں ہے۔ دوازدہ امامی حضرات نہ صرف اس کے قائل ہیں، بلکہ اِس کو جزو دین سمجھتے ہیں، اِسی لئے اس کے جواز میں قرآنی آیات واحادیث پیش کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دوازدہ امامی حضرات کے نزدیک احادیث نبوی کے علاوہ اُن کے اَئمہ کے اقوال بھی حجّت ہیں۔ مُلا فتح اللہ کاشانی نے سورۂ آل عمران کی اٹھائیسویں آیت کی تفسیر لکھتے ہوئے جوازِ تقیہ کے دلائل پیش کئے ہیں۔ اس آیت کو مطبوعہ منہج الصادقین میں سَتّائیسویں آیت قرار دیا گیا ہے۔ بہرحال اِس آیت کی تفسیر میں مُلا فتح اللہ کاشانی کا اندازِ تفسیر یہ ہے:

''(لایَتَّخِذِالْمُومِنُونَ) باید کہ فرانگیرند مومنان کہ دوستان کہ دوستانِ خدایند ومعزز ومکرم نزد او (الکافرین) ناگروا ودیدگان را کہ دشمنان اویند وذلیل وخوار نزدِ او (اولیاء) دوستان ومتولیان امور خود (من دون المومنین) بدون مومنان یعنی دوست مومن جز مومن نہ باید پس مومنان باید کہ کافران را بدوستی . . . وبعد از آن جہت تہدید از موالات با کفار می فرماید کہ (ومن یفعل ذلک) وہر کہ بکند این فرا گرفتن ودوستی را با

دشمنان (فلیس من اللہ) پس نیست آنکس از ولایت و دوستئ خدا (فی شیءٍ) در چیزی یعنی از دوستی خدا بہرۂ نہ خوہد داشت چہ موالات متعادیین مجتمع نمی شود۔''

(لایتخذالمومنون) وہ مومنین جو اللہ تعالی کے دوست اور اُس کی نظر میں معزز و مکرم ہیں، اُن کو چاہیے کہ خَلا مَلا نہ رکھیں (الکافرین) کافروں سے، جو کہ اللہ کے دشمن اور اُس کی نظر میں ذلیل خوار ہیں (اولیاء) انہیں اپنے معاملات میں دوست اور ذمہ دار نہ بنائیں (من دون المومنین) سوائے مومنوں کے، یعنی مومن کا دوست مومن کے علاوہ کوئی نہ ہو۔ اس لئے مومنوں کو چاہئیے کہ دوستی کے لئے کافروں کا انتخاب نہ کریں ... کافروں سے موالات کرنے کی اِس تنبیہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے: (ومن یفعل ذٰلک) اور جو شخص بھی دشمنوں سے دوستی اختیار کرتا ہے (فلیس من اللہ) وہ شخص اللہ کی سرپرستی کے قابل نہیں (فی شیئ) کسی چیز میں، یعنی اللہ کی سرپرستی میں اپنا حصہ نہیں رکھے گا (یعنی نہیں پائے گا) کیونکہ ایک دوسرے کے متضاد لوگوں کی محبت و اخوت یکجا نہیں ہوسکتی۔)

''یا معنی آن ست کہ از دین خدا بہرہ نہ دارد یعنی مسلمان نیست (اِلّا أنْ تَتَّقُوا) مگر آن کہ بترسید و حذر کنید (منھم) از ایشان یعنی از ضرر کافران (تُقٰۃً) آن چیزی را کہ وا جب باشد اتقا و پرہیزیدن از آن، و می تواند بود کہ نصب تقیہ بر مصدریہ باشد یعنی بترسید از ضرر ایشان ترسیدنی کہ درین صورت جائز باشد کہ با ایشان اظہار دوستی کنید و تعدیہ تتقوا بمن جہت آنست کہ مضمن معنی تحذر و است یا تخافوا (وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہ) و می رساند شما را خدای در ارتکاب مناہی کہ از جملۂ آن موالات است با دشمنان او (نَفْسَہ) از عذاب ذات خود یعنی عذابی کہ صادر شدہ باشد از محض قہاریت حق تعالی بیواسطہ غیری ، و نفس عبارت است از ذات چیزی و حقیقت و ھویت او۔ پس ہر کجا لفظ در شأن حق تعالی ایراد کنند مراد ذاتِ او خواہد بود و در این کلام تہدیدِ عظیم است بمناہی مناہی در فتح ، و ذکرِ نفس بجہت آنست کہ تا معلوم شود کہ محذر منہ عقابیست صادر از ذات او و عقابیکہ ما دون عقاب او است غیر معتد بہ است و در جنب آن چیز نمی ماند (وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْر) و بسوی جزا یا حکم خداوند است بازگشت ہمہ، و جمیع بندگان را بر وفق اعمال جزا خواہد داد این تتمہ وعید است۔''

(یا اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین سے حصہ نہیں پاتا یعنی مسلمان یعنی

کافروں کے ضرر سے (تُـقٰـۃ) اِس سے مراد وہ چیز ہے جس سے بچنا واجب ہوتا ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تُـقٰـہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہو،یعنی تم اُن لوگوں سے دوستی کا اظہار کرو اور "تتقوا" متعدی اِس وجہ سے ہے کہ یہ "تحذروا" (یعنی بچو) یا "تخافوا" (ڈرو) کے معنی میں ہے (ویحذرکم اللہ) اور اللہ تعالیٰ تم کو گناہوں کے ارتکاب سے ڈراتا ہے (اور) اُن گناہوں میں اللہ کے دشمنوں سے دوستی بھی شامل ہے (نـفـسـہٖ) ڈراتا ہے خود اپنی ذات کے عذاب سے،یعنی وہ عذاب جو حق تعالیٰ کی قہاریت کی وجہ سے کسی غیر کے واسطے کے بغیر صادر ہوتا ہے اور نفس کسی چیز کی ذات اور اس چیز کی حقیقت و ہویت (Essence) سے عبارت ہے، اِس لئے ہر اُس جگہ جہاں اللہ تعالی کی شان میں لفظ نفس کا لوگ استعمال کرتے ہیں، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی اور اِس کلام میں (یعنی زیرِنظر آیت) میں قبیح گناہوں کے ارتکاب پر سخت وعید ہے اور نفس کا ذکر اس وجہ سے ہے، تاکہ معلوم ہو کہ جس چیز سے ڈرایا جارہا ہے وہ ایسی سزا ہے جو اللہ کی ذات سے صادر ہوتی ہے اور وہ سزا جو اِس کی سزا سے کم ہے اُس کا کوئی شمار نہیں اور اُس کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے (والـی اللـہ المصیر) انعام کے لئے یا خدا کے حکم سے سب کی واپسی اُسی کی طرف ہے اور وہ تمام بندوں کو اُن کے اعمال کے مطابق انعام دے گا۔ یہ بات تنبیہ کا تتمّہ ہے۔

''وضحاک برآن است کہ آیہ در بارہ عبادہ بن صامت فرود آمد، واو مردی متقی بود از اہل بدر، وویرا حلفا بود نداز یہود چون رسول روز احزاب ازمدینہ بیرون آمد، گفت یارسول اللہ ! اگر اجازہ فرمائی من حلفای خود را کہ پانصد یہود بودند باعانت شما خوانم تا با کافران جنگ کنند۔حق تعالی این آیہ فرستاد ومنع آن فرمود''

(اور ضحاک کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت عبادہ بن صامتؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔وہ اہل بدر میں سے ایک متقی فرد تھے اور یہودیوں کے کئی گروہ اُن کے حلیف تھے۔جب جنگ احزاب کے دن پیغمبرﷺ مدینہ سے باہر تشریف لائے تو (عبادہ بن صامت نے) کہا: یارسول اللہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے حلیف یہودیوں کو، جن کی تعداد پانچ سو ہے، آپ کی مدد کے لئے بلالوں، تاکہ وہ لوگ (بھی) کافروں سے جنگ

کریں (اُس وقت) اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی اور (عبادہ بن صامتؓ کی) بات (ماننے) سے منع فرمایا۔)

''وجواز تقیہ مذکور در وقتی بود کہ دین اسلام ہنوز قوتی نہ داشت و کفار را قوت تسلط بود بر مسلمانان و چون قضیہ منعکس شد تقیہ مرتفع گشت، و چون تقیہ در ہر موضعیست کہ مظنہ ضرر نفس یا مال باشد چنانکہ آیہ مذکور مصرح است بر آن پس اہلِ خلاف را رسد کہ زبان طعن بر امامیہ دراز کنند و دیگر منطوق "وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ اِلَى التَهْلُكَةِ" و بادلیہ عقلیہ دالہ بر وجوب دفع ضرر از نفس، تقیہ واجب است و صحابۂ رسول باین امر اقدام نمودہ اند و از جملہ عمارِ یاسر با کفار اظہار موافقت میکرد بہ جہت دفع ضرر تا خدای تعالی در حق او این آیہ فرستاد کہ "**الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان**" و از حضرت صادق علیہ السلام مروی است کہ فرمود "**التقیہ دینی و دین آبائی**" تقیہ دین من است و دین پدران من، و از آبای آں حضرت، بود کہ در اوائل اسلام اہلِ کفر ملا یمت می نمود و امیر المومنین علیہ السلام کہ با اہل خلاف بطریق ملاطفت سلوک میکرد و چون قوت پیدا کردند شمشیر از غلاف بیرون کشیدہ با اہل کفر و خلاف آغاز محاربہ کردند۔ مردیست کہ مردی نزد پیغمبر آمد و گفت یارسول اللہ بفریاد من رس کہ بہ ہلاکت و شقاوت گرفتار شدم۔ فرمود از تو چہ صادر شد؟ گفت کفار قریش مرا گرفتند و عذاب میکردند تا نسبت بجناب تو ناسزائی بگویم، من بی طاقت شدہ آنچہ ارادۂ ایشان بود بزبان من جاری شد۔ فرمود "**کیف قلبک**" دلت چہ گونہ بود۔ گفت بسیار از آن کارہ بود، فرمود کہ اگر بار دگر بدست ایشان افتی دمنل (کذا) این حال بر تو واقع شود آنچہ ایشان ارادہ کنند بگو و در دل کارہ این باش۔ از عبداللہِ مسعود نقل است کہ "**خالطوا الناس و صافحوھم بمایشتھون**" با مردمان یعنی با اہل خلاف مخالطہ کنید و با ایشان مصافحہ نمائید و دست در دست ایشان نہید بآنچہ ایشان خواہند یعنی ظاہراً با ایشان اظہار محبت و مودت کنید امّا باید کہ در اعتقاد شما قصوری و فطوری راہ نہ یابد، ابن بابویہ در رسالۂ اعتقادیہ آوردہ کہ تقیہ واجب است، ہر کہ آنرا ترک کند چنانست کہ ترک نماز کردہ۔''

(اور وہ تقیہ جس کا ذکر ہوا ہے، اُس کا جواز اُس وقت تک تھا جب دینِ اسلام ابھی بے طاقت تھا اور مسلمانوں پر کفار کو غلبہ کی قوت حاصل تھی اور جب حالات برعکس

ہوگئے تو تقیہ کی اجازت ختم کردی گئی۔ اور چونکہ تقیہ اُس جگہ کے لئے ہے جہاں جان یا مال کا خطرہ ہو،جیسا کہ مذکورہ آیت میں تصریح کی گئی ہے، اِس لئے اہل خلاف (سُنی) کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ امامیہ (افراد) پر زبان طعن دراز کریں۔ اِس کے علاوہ ارشادِ باری تعالی "**ولاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ**" (بقرہ:۱۹۵) ''اوراپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں مت ڈالو'' اور دلیل عقلی کی بنا پر جان کونقصان سے بچانے کے لئے تقیہ واجب ہے اوراصحاب رسول ﷺ نے اِس پرعمل کیا ہے،من جملہ اورلوگوں کے عماربن یاسرضرر سے بچنے کے لئے کافروں سے موافقت کا اظہار کرتے تھے۔اللہ تعالی نے اُن ہی کے واسطے یہ آیت نازل کی ہے "**الّامن اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان**" جناب صادق سے مروی ہے ''تقیہ میرااورمیرے آباکامذہب ہے'' جناب صادق کے آباء میں رسالت پناہ ﷺ بھی تھے جواسلام کے ابتدائی دور میں کافروں سے ملائمت (کا عمل) فرماتے اور امیرالمومنین (مرادحضرت علیؓ) اہل خلاف (خلفائے ثلاثہ اوراُن کے پیرو؟) سے لطف وکرم کا سلوک کرتے اور جب اُن میں قوت پیداہوگئی (تو) انہوں نے کافروں اوراہل خلاف کے خلاف تلوارمیان سے نکالی اوراُن سے جنگ کی ابتدا کی۔

روایت ہے کہ ایک شخص آں حضرت ﷺ کے پاس آیا اوراُس نے کہا:یارسول اللہ میری فریادرسی کیجیے کہ میں ہلاکت اور پریشانی میں گرفتار ہوگیاہوں،آپؐ نے فرمایا:تم سے کیا بات صادرہوگئی ہے؟ اُس نے کہا: کفارِقریش نے مجھ کوپکڑلیااورمجھ کوتکلیفیں دے کر مجبور کیا کہ میں آپؐ کوبرا بھلا کہوں، میں بے طاقت ہوگیا اور جو کچھ وہ لوگ چاہتے تھے میری زبان پر جاری ہوگیا۔آپ نے دریافت فرمایا:تمہارادل کس عالم میں تھا؟ اُس نے کہا: میرادل اِس بات کوبہت زیادہ ناپسندکررہاتھا۔آپؐ نے فرمایا:اگردوسری بارتم ان لوگوں کے ہاتھوں میں پڑواوراِسی طرح کامعاملہ تمہارے ساتھ پیش آئے تو وہ لوگ جو کچھ کہنے کوکہیں وہ کہہ دو،دراں حالے کہ تمہارا دل اُسے ناپسندکررہاہو۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "**خالطوا الناس وصافحوھم بمایشتھون**''لوگوں یعنی مخالفوں سے اختلاط رکھواورجوچیزوہ چاہتے ہیں(اُس کے لئے) اُن کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ ڈالو، یعنی ظاہری طور سے اُن سے دوستی اورمحبت کا اظہارکرو،لیکن تمہارے اعتقادمیں کوئی

کمی اورفتوررا ہ نہ پانے پائے ۔ ابن بابویہ نے رسالۂ اعتقادیہ میں لکھا ہے کہ تقیہ واجب ہے اور جوشخص تقیہ کوترک کرتا ہے وہ بالکل اُسی طرح سے ہے جیسے اُس نے نمازترک کردی۔)

''وحضرت صادق علیہ السلام راگفتند یاابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما مردی رادرمسجدمی بینیم کہ بعلانیہ وآوازسبّ ولعن می کنداعداءشماراونام ہریک ازایشان رامی برد، فرمود''مالہ لعنہ اللہ تعرض بنا'' یعنی چہ می شوداوراخداوی راازرحمت خود دورگرداندمارامعرض تیرسب می گرداندچہ حق تعالیٰ فرمودہ کہ "ولاتسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوابغیر علم" ونیزازصادق علیہ السلام کہ درتفسیراین آیہ کہ ''ولاتسبواالذین ،الخ'' فرمودکہ چون این آیہ نازل شدرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می فرمودکہ "ولاتسبواعلیافان ذاتہ مموس بذات اللہ من سبّ ولی اللہ فقدسبّ اللہ ولاتسبوھم فانھم یسبون علیکم" سبّ مکنیدعلیؓ راکہ حق سبحانہ مسِ ذات اوکردہ ،مرادشدتِ قرب مرتبۂ آن حضرت است نزدحق تعالیٰ ہرکہ سبّ کنددوست خداراپس بہ تحقیق کہ سبّ خداکردہ ،وسبّ کفارمی کنید ومخالفینِ دین را، کہ ایشان سب کنندشماراء، بعدازآن فرمودکہ پیغمبرصلی اللہ علیہ وسلم امیرالمومنین علیہ السلام راخطاب کردکہ ''من سبّک یاعلی، فقد سبنی ومن سبنی فقد سب اللہ " ہرکس سبّ کندترااے علی بہ تحقیق کہ سبّ من کردہ وہرکہ سبّ من کردہ بدرستیکہ سب خداکردہ، وشیخ مذکورہ بعدازنقل این کلام دررسالۂ مذکورہ ، فرمودہ تقیہ واجب است ورفع آن جائزنیست تابظہورقائم آل محمدپس ہرکہ قبل ازظہورآنحضرترک کندازدین خدادین امامیہ خارج باشدوباخداورسول وائمہ مخالفت کردہ''

(لوگوں نے جناب صادق سے دریافت کیا کہ یاابن رسول اللہ! ہم ایک شخص کومسجد میں دیکھتے ہیں جواعلانیہ بہ آوازبلندآپ کے دشمنوں کو برا بھلاکہتا اورگالیاں دیتاہےاوراُن میں سے ہرایک کانام لیتاہے۔انہوں نے فرمایا''مالہ لعنہ اللہ تعرض بنا'' یعنی اُسے کیا، خدوندتعالیٰ اُس کواپنی رحمت سے دورکردے جوہم کوگالیوں کے تیرکی بوچھارمیں رکھتاہے، کیوں کہ اللہ کافرمان ہے "ولاتسبواالذین یدعون من دون

اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم" اور جناب صادق سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**ولاتسبوا علیافان ذاتہ ممسوس بذات اللہ من سب ولی اللہ فقدسب اللہ ولاتسبوھم فانھم یسبون علیکم**" علی کو گالیاں مت دو، کیوں کہ اللہ تعالی نے علی کی ذات کو مَس کیا ہے (اس سے) مراد یہ ہے کہ اُن کی ذات اللہ تعالی سے بہت قریب ہے۔ جو شخص اللہ کے ولی (دوست) کو گالی دیتا ہے وہ بہ تحقیق اللہ کو گالی دیتا ہے اور مخالفین دین اور کافروں کو گالیاں مت دو کہ وہ تم کو گالیاں دیں۔ اِس کے بعد پیغمبر ﷺ نے حضرت علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **من سبّک یاعلی ، فقدسبّنی ومن سبّنی فقدسبّ اللہ**" اے علی! ہر وہ شخص جو مجھ کو گالی دے وہ بالکل اِسی طرح ہے جیسے اُس نے اللہ کو گالی دی ہو۔ شیخ مذکور (ابن بابویہ) نے اپنے رسالہ میں اِس بات کو نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ جب تک قائم آل محمدؐ کا ظہور نہ ہو جائے، تقیہ واجب ہے اور اُس کا چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ پس ہر وہ شخص جو قائم آل محمد کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کرتا ہے وہ امامیہ اور اللہ کے دین سے خارج ہو جاتا ہے اور اللہ، رسول اور اماموں کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے۔)

"وصادق علیہ السلام راز کریمہ "اِنّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہ اتقٰکُم" پرسیدند فرمودای **اعلمکم واعملکم بالتقیۃ**، یعنی گرامی ترین شمانزدمنا کسیست کہ **اعلم واعملکم باشد بتقیہ**، ونیز آنحضرت فرمود کہ **انی لاسمع الرجل فی المسجد وھو یشتمنی فاستترمنہ بالسارية کیلا یرانی** یعنی من می شنوم کہ مردی مرادشنام می دہد پس من خود را از اومی پوشانم وپسِ ستون مسجد می روم تامرانہ بیند ونیز فرمودہ کہ پے ظاہر ما مردم مخالطہ کنید و بہ باطن مخالفت نمائید وفرمود کہ **الریامع المومن شرک ومع المنافق فی ارہ عبادۃ** ریا با مومن شرک است و با منافق در خانۂ او عبادت و امیر المومنین علیہ السلام فرمودہ کہ **من صلی خلفھم فی الصف الاول فکأنما صلی مع رسول اللہ فی الصف الاول** ۔ ہر کہ نماز گذارد در صف اول باھل خلاف ہم چنان است کہ در صف اواول با رسولِ خدا نماز کردہ نیز فرمود کہ **عودوامرضاھم وصلونی**

مساجدھم ، عیادت مرضای اہل خلاف کنید و بر جنازہ ہای ایشان حاضر شوید و نماز گذارید در مسجد ایشان، بعد از آن فرمود کو نوا لنا زینا و لا تکونوا علینا شینا ۔یعنی از برای ما آرایش وزینت باشید و مباشید بر ما شین و آلائش ۔یعنی با اہل خلاف چنان سلوک کنید وحسن معاشرت نمائید کہ ایشان مادح باشند و راغب ما گردند نہ آنکہ بایشان عناد در زید و بجہت زبان بہ بدگوئی ما بکشایند، و نعم ماقیل: وارضھم مادمت فی ارضھم ودارھم مادمت فی دارھم."

(لوگوں نے جناب صادق سے آیت "اِنّ اکرمکم عنداللہ اتقکم" کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یعنی اللہ کے نزدیک تم میں افضل ترین وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور تقیہ پر سب سے زیادہ عمل کرنے والا ہو، اِس کے علاوہ انھوں نے فرمایا: میں سنتا ہوں کہ ایک شخص مجھ کو گالی دے رہا ہے (تو) میں خود کو اُس کی نظروں سے بچاتا ہوں اور مسجد کے کھمبے کے پیچھے چلا جاتا ہوں، تاکہ وہ مجھ کو نہ دیکھے اور یہ بھی فرمایا کہ "لوگوں سے بہ ظاہر ملے رہو اور بہ باطن اُن سے اختلاف کرو اور فرمایا "مومن (مراد شیعہ) سے ریاکاری کرنا شرک ہے اور منافق سے اُس کے گھر میں ریا کرنا عبادت ہے" اور امیر المومنین (حضرت علیؑ) نے فرمایا "ہر وہ شخص جو مخالفوں کے ساتھ پہلی صف میں نماز پڑھتا ہے وہ بعینہ اُسی طرح ہے جیسے اُس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پہلی صف میں نماز پڑھی ہو" اور (حضرت علیؑ نے) "یہ بھی فرمایا کہ اہل خلاف کے مریضوں کی عیادت کرو اور اُن کے جنازوں پر جاؤ اور اُن کی مسجدوں میں نماز پڑھو" پھر فرمایا "ہمارے (شیعوں کے) لیے آرائش اور زینت بنو، آلائش اور دھبہ نہ بنو۔ یعنی مخالفین (اہلِ خلاف) سے ایسا سلوک کرو کہ ایسی حسنِ معاشرت دکھلاؤ کہ وہ لوگ ہمارے مدّاح ہو جائیں اور ہماری طرف راغب ہوں، یہ نہ کرو اُن سے عناد برتو، جس کی وجہ سے وہ ہم پر بدزبانی کے لئے اپنی زبان کھولیں، اور کتنی اچھی بات کہی گئی ہے کہ جب تک اُن کی زمین میں رہو ان کو خوش رکھو اور جب تک ان کے گھر میں ہو ان کی موافقت کی بات کرو۔)

"و در تفسیر ابوالفتوح (رازی) مذکور است کہ حشام بن سالم روایت کند کہ چون صادق علیہ السلام بمقعد صدق قرار گرفت، من و محمد بن نعمان صاحب الطاق و ابوجعفر

الاحول و جماعتی از اصحاب آنحضرت در مدینہ بودیم ،مردمان گمان بردند کہ عبداللہ جعفر کہ پسر مہتر آنحضرت بود امام و قائم مقام اوست ،نزدیک اوشدیم و گفتیم : یابن رسول اللہ اگر مردی دویست درہم دارد بر اوزکاۃ چند باشد؟ گفت پنج درہم، گفتم اگر صد درہم داشتہ باشد؟ گفت دو درہم ونیم ۔گفتم یابن رسول اللہ مرجیان چنین نمی گویند،گفت من نمی دارم کہ چہ می گویند۔ ماازنزداو بیرون آمدیم ودانستیم کہ اوامام نیست ،قلت علم درشرع ۔پس درگوشہ بہ نشستیم وبا یک دیگری گفتیم کہ بعدازاین نزد کہ رویم؟ واگرمسئلہ مارامشکل شود بکہِ رجوع نمائیم ؟الی المرجئۃ ام الی الزیدیہ ام المعتزلہ ۔ دراثنای این حال پیری از دردرآمد کہ اورانمی شناختیم واشارہ بابی جعفرالاحول کردواوراطلبید ،ومابیچ شک نمی کردیم کہ وی از جواسیس ابومنصور دوانقی است واورافرستادہ تامعلوم کندکہ شیعہ صادق علیہ السلام ملتجی بکہ شوندوکرا قائم مقام اوگردانند؟ من گفتم انا للہ وانا الیہ راجعون ، ابوجعفرالاحول گفت مراکارافتادہ شما بگوشہ متواری شوید تاشمانیز بدامِ ہلاکت نیفتید،من نزدیک خانہ موسیٰ بن جعفر بگوشہ متواری شدیم ، ودرفکردوردرازافتادم ،ناگاہ خادم آنحضرت ازخانہ بیرون آمدوگفت بیاکہ مولای من ترامی خواند۔من دررفتم ، چون چشمش برمن افتادفرمود ’’**اِلیّ الیّ لاالی المرجیہ ولاالی الجبریہ ولاالی الزیدیہ ولاالی المعتزلہ**‘‘ ومن نزداو بنشستیم واورا گفتم یابن رسول اللہ پدرت بجوارحضرت عزت رفتہ اکنون رجوع بکہ کنیم ،فرمود ’’**انشاء اللہ ان یھدیک ھدٰیک**‘‘

(تفسیرابوالفتوح (رازی) میں درج ہے کہ ہشام بن سالم روایت کرتے ہیں کہ جب جناب صادق مسند صدق پر متمکن ہوئے میں اور محمد بن نعمان صاحب الطاق اور ابوجعفرالاحول اور جناب صادق کے پیروؤں کی ایک جماعت، ہم سب مدینہ میں موجود تھے۔لوگوں نے گمان کیا کہ عبداللہ (بن) جعفر جو کہ حضرت کے سب سے بڑے فرزند تھے، اُن کے قائم مقام اور امام ہیں ۔ہم لوگ اُن کے (یعنی عبداللہ) کے پاس گئے اور اُن سے عرض کیا: اے ابن رسول اللہ ایک شخص کے پاس دوسو درہم ہیں، اُس شخص پر کتنی زکوٰۃ واجب ہے؟ انہوں نے جواب دیا: پانچ درہم ۔میں نے دریافت کیا کہ اگر اُس کے پس سو درہم ہوں تو ؟انہوں نے جواب دیا: ڈھائی درہم۔ میں نے عرض کیا: اے

ابنِ رسول اللہ، مرجئ اس طرح نہیں کہتے ۔انہوں نے فرمایا: مجھ کونہیں معلوم کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ ہم اُن کے پاس سے واپس آ گئے اور ہم نے سمجھ لیا کہ وہ شرعی علم کی کمی کی وجہ سے امام نہیں ہیں۔ اِس کے بعد ہم لوگ ایک کونے میں بیٹھ گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ اب اِس کے بعد کس کے پاس چلیں، اگر ہم کو کوئی مسئلہ مشکل معلوم ہو تو ہم کس سے رجوع کریں؟ مُرجئہ سے یا قدریہ سے یا زیدیہ سے یا معتزلہ سے؟ اِسی اثنا میں ایک بوڑھا شخص دروازے سے اندر آیا، جس کو ہم نہیں پہچانتے تھے ۔اس شخص نے ابوجعفر الاحول کی طرف اِشارہ کیا اور اُن کو اپنے پاس بلایا ۔ ہم نے اِس بات میں کوئی شبہ نہیں کیا کہ وہ ابومنصور دوانقی کے جاسوس میں سے ہے اور (ابومنصور دوانقی نے) اس کو بھیجا ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ جناب صادق کے شیعہ کس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور کس کو جناب صادق کا قائم مقام سمجھتے ہیں ۔ میں نے اِنا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ابوجعفر الاحول نے کہا: میرا تو کام تمام ہوا۔تم لوگ کسی جگہ بھاگ جاؤ، تا کہ تم ہلاکت کے جال میں نہ پھنسو۔ میں موسیٰ بن جعفر کے گھر کے نزدیک ایک گوشہ میں فرار ہو کر اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہو گیا۔ ناگاہ آں حضرت (جناب صادق) کا ملازم گھر سے باہر آیا اور اُس نے کہا: آؤ، میرے مالک تم کو بلاتے ہیں۔ میں اندر گیا۔جب اُن کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے فرمایا ''میرے پاس آؤ، نہ مُرجئہ کے پاس جاؤ نہ جبریہ کے پاس نہ زیدیہ کے پاس نہ معتزلہ کے پاس۔ میں اُن کے قریب بیٹھ گیا اور اُن سے کہا: اے ابن رسول اللہ، آپ کے والد، حضرتِ عزت (اللہ تعالی) کی پناہ میں تشریف لے گئے، ہم کس سے رجوع کریں؟ انہوں نے فرمایا: اگر اللہ تمہیں راہ دکھانا چاہے گا تو دکھائے گا۔)

''گفتم یابن رسول اللہ برادرت دعویٔ امامت می کند فرمود ''**عبدالله یریدان لایعبدالله**'' عبداللہ می خواہد کہ خدا ایرانہ پرستند، گفتم یابن رسول اللہ **فمن لنابعده امام**، بعداز پدرت امام کیست؟ فرمود ''**انشاء الله ان یهدیک هدیٰک**'' گفتم یابن رسول اللہ تو امامی پس پدرت؟ گفت دراین مسئلہ جواب نمی گویم، من دراین باب مبالغہ والحاح کردم بعداز آن گفتم یابن رسول اللہ ''**علیک امام**'' برتو امام ہست، گفت نہ من چون این سخن بشنیدم چندان ہیبت او در دل من رسید کہ در دائرہ وصف نہ گنجد، گفتم یابن رسول اللہ

دستوری باشدتامسائلی ومشکلاتی کہ مراہست بپرسم ،چنانکہ ازپدرت من پرسیدم ،فرمودپرس ہرچہ می خواہی ،من مسائل بسیار پرسیدم ہمہ راجواب دادبعدازآن فرمود '' **علیک بالکتمان فان اضعت فھو الذبح**'' برتوباد کہ این ہارا پنہاداری پس اگر ضایع کنی آنرا موجب کشتن شود۔گفتم یابن رسول اللہ شیعۂ متحیر وسرگردانند رخصت باشدکہ ایشان بجانب توہدایت کنم؟فرمودا گرکسی رابیتی کہ سیمای اواثر رشد پیدا باشدعہدی و معیاقی ازوبستان برکتمان ومحافظت تقیہ ، چہ اگراین حدیث آشکاراشودبیم قتل باشد ''**واشار بیدہ الی حلقہ**'' وبدست خوداشارہ بہ حلق خودکرد،من بیرون آمدم وبااصحاب خود ملاقات کردم،گفتندکہ "**وماوراء ک**"چیست ازپس تو؟گفتم ''**الھدیٰ**'' راہ راست وایشان ازاین قضیہ مطلع ساختم بعدازآن بہ تدریج اصحاب صادق علیہ السلام نزدِ آنحضرت می آمدندتابراوجمع شدندودرخفیہ ازصحبت اومستفیدمی شدندوسیرت سائرائمہ علیہ السلام درعہدظلمۂ بنی امیہ وبنی عباس تقیہ بودہ ،پس چگونہ واجب نہ بودہ باشد؟ وچون حق سبحانہ مومنان رارخصت دادد رکتمان حق ومساعدت کافران ومواسات نمودن بامخالفان جہت دفع مضرت ایشان درعقب آن بیان نمودکہ اگرکسی این معنی راکار بندنہ بہ جہت خوف وعذر بلکہ از روی اعتقادورغبت قلبی **بااھل کفر** وخلاف موافقت ومساعدت نمایدبہ عقوبت ابدی گرفتارگردد۔''

(میں نے عرض کیا: اے ابن رسول اللہ، آپ کے بھائی امامت کا دعویٰ کرتے ہیں۔انہوں نے فرمایا: عبداللہ چاہتا ہے کہ لوگ خدا کی عبادت نہ کریں۔میں نے عرض کیا: یاابن رسول اللہ، آپ کے والد کے بعد ہمارا امام کون ہے؟انھوں نے فرمایا: ''اگراللہ تمھیں راہ دکھانا چاہے گا تو دکھائے گا''میں نے کہا: اے ابن رسول، کیا آپ اپنے والد کے بعدامام ہیں؟ فرمایا: میں اس مسئلہ میں جواب نہیں دوں گا، میں نے اس سلسلے میں بہت فریادوزاری کی، اِس کے بعد میں نے کہا: اے ابن رسول اللہ ،کیاآپ پرکوئی امام ہے؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے جب یہ بات سنی تو میرے دل میں اتناخوف پیدا ہوا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔میں نے کہا: اے ابن رسول اللہ، اگر اجازت ہوتو جس طرح آپ کے والد سے مسائل اور مشکلات دریافت کیا کرتا تھا اُسی طرح میں آپ سے وہ مسئلے

اوروہ مشکلیں دریافت کروں جو مجھ کو درپیش ہیں۔ انہوں نے فرمایا: جو چاہو پوچھو۔ میں نے بہت سے مسئلے دریافت کیے۔انہوں نے سب کا جواب دیااِس کے بعد فرمایا ''**علیک بالکتمان فان اضعت فھو الذبح**'' تم پرلازم ہے کہ اِس بات کو پوشیدہ رکھو۔ اگر ضایع[۳] کروگے تو باعثِ قتل ہوگا۔ میں نے کہا: یا ابن رسول اللہ، آپ کے والد کے شیعہ حیران وسرگرداں ہیں۔ اگر اجازت ہوتو میں ان کوآپ کی جانب سے ہدایت دوں؟ انہوں نے فرمایا: اگرتم کسی ایسے کودیکھو کہ جس کے چہرے بشرے سے رُشد کا اثر آشکار ہوتو تم اُس سے تقیہ کی محافظت اور پوشیدہ رکھنے پرعہدو پیمان لو، اگر یہ بات ظاہر ہوگئی تو قتل (ہوجانے) کا خطرہ ہوگا اورانہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ میں باہرآیا اوراپنے ساتھیوں سے ملا۔ اُن لوگوں نے پوچھا: تمہارے ساتھ کیا ہے (یعنی کیا خبر لائے ہو) میں نے جواب دیا: سچائی کا راستہ، اوراُن لوگوں کوتمام باتوں سے مطلع کیا۔ اِس کے بعد جناب صادق کے اصحاب اُن کے گردجمع ہوئے اور پوشیدہ طور پر اُن کی صحبت سے استفادہ کرتے رہے۔ امویوں اور عباسیوں کے عہدظلمت میں تمام ائمہ کی سیرت تقیہ تھی۔ پھر کس طرح سے (تقیہ) واجب نہ رہا ہوگا اور جب اللہ تعالی نے کافروں اور مخالفوں کے ضرر سے بچنے کے لئے کافروں کی مدد اور مخالفوں کی ہمت افزائی کی اجازت دی ہے اوراس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ اگرکوئی شخص خوف اورعذر کی وجہ سے نہیں، بلکہ کافروں سے دِلی لگاؤ کی وجہ سے مدد کرتا اورموافقت کا اظہار کرتا ہے وہ ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہوگا۔)

یہ جس آیت کی تفسیر ہے اُس کا ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے یوں کیا ہے:

> '' نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اُس کو اللہ سے کوئی تعلق، مگر اُس حالت میں کہ کرنا چاہو تم اُن سے بچاؤ۔ اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

مُلّا فتح اللہ کاشانی کی تفسیری روش کو سمجھنے کے لئے صرف یہی دو مثالیں کافی ہوں گی۔ بعض بعض جگہوں پر واضح اور بیش تر جگہوں پر غیر واضح اور در پردہ انہوں نے اِس

بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اپنے مسلک کو درست اور حق ثابت کریں اور 'مخالفین' کے مسلک کو باطل۔ اِس کے باوجود اُن کے یہاں وہ شدت اور زبان کی وہ کرختگی کم ملتی ہے جو اُن کے عہد کے بعد کی فارسی تفسیروں میں ملتی ہے۔ ہم نے تو منہج الصادقین کا تعارف کرادیا ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اس تفسیری کاوش کا غائر نظروں سے مطالعہ کر کے صفویوں کے عہد کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی باتوں کا نہ صرف پتہ لگایا جائے، بلکہ اُن کا مزید مطالعہ کر کے بہت سے ایسے حقایق وافکار کو منظر عام پر لایا جائے جن کو ہم یا تو فراموش کر چکے ہیں یا اُن سے یکسر ناواقف ہیں۔

مُلا فتح اللہ کاشانی نے 'نساؤُ کم حرث لکم' کی تفسیر میں جو باتیں تحریر فرمائی ہیں خوفِ فسادِ خلق سے ہم اُن سے یکسر صرفِ نظر کر رہے ہیں۔ اگر کسی جواں مرد میں اتنی ہمت ہو کہ وہ سنگ ملامت کھا سکے تو اُس پر قلم اٹھائے۔ لیکن انداز حقایق کو پیش کرنے والا ہو، مناظرہ ومجالہ کا نہ ہو۔

ہمارے محدود علم کے مطابق ابھی تک اردو زبان میں منہج الصادقین کا کوئی مطالعہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر مطالعے کی طوالت کی وجہ سے یہ بحث رہی جاتی ہے کہ مُلا فتح اللہ کاشانی کی تحریر میں جو الفاظ آئے ہیں ان میں کتنے متروک ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ اب کون کون سے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم مذہبی تحریروں کو نہ تو ادب سمجھتے ہیں اور نہ اُن کی زبان کی عہد بہ عہد ترقی یا تغیر وتبدل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے البتہ مذہبی علوم کے مطالعے سے فارسی کے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے منظر نامہ کو ضرور پیش کیا ہے، مگر وہ خشت اول ہے۔ اردو میں تو ایسا کام کرنے والے شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو سکیں۔ خوش قسمتی سے پروفیسر سادات ناصری کی ایک تحریر سے ہم ایک مختصر سی فہرست ان الفاظ کی مرتب کر سکے ہیں جو مُلا فتح اللہ کاشانی کے زمانے میں مستعمل تھے اور آج ان کی جگہ دوسرے الفاظ نے لے لی ہے۔ ہم اسی فہرست پر اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

ابداء بہ معنی شروع واختراع وایجاد

اعادہ بہ معنی دوبارہ وبازگشت۔

داء بہ معنی بیماری۔
اثابہ بہ معنی پاداش۔
سیاط معنی شاخہ ہای گندنا (ایک پھول)
جُبّہ بہ معنی پیشانی شیر
انہاک بہ معنی کوشیدن درکاری۔سخت سرگرم شدن بہ اَمری۔ستیزہ کردن
ذھول بہ معنی مشغول شدن۔فراموش کردن۔غافل شدن۔فراموشی۔غفلت
ایعاد بہ معنی بیم دادن۔سہم دادن۔ترساندن
مختبر بہ معنی آزمودہ۔امتحان شوندہ۔مظاہرہ بہ معنی یاری
تقلیب حدقہ بہ معنی چشم گردانیدن۔نظر برگماشتن ونظرانداختن
اِتّساع بہ معنی توسعۂ معنی۔
مظاہرہ بہ معنی یاری
منطوی بہ معنی درپیچیدہ شوندہ، حادی، مشتمل۔
تقریع بہ معنی سرزنش کردن، ملامت کردن
ایقاع بہ معنی افگندن، درانداختن، ہم آہنگ ساختن آوازہا
ذمیم بہ معنی زشت، نکوہیدہ، مذموم۔
تزہید بہ معنی زاہدکردن، پارسا خواندن
حبوب غاذیہ وثمار وبقول بہ معنی دانہ ہای نباتات خوردنی، میوہ ہا وترّہ ہا وسبزیہا

حواشی ومراجع

۱ دوازدہ امامی حضرات کے آخری امام، مہدی جواُن کے گیارہوں امام حسن عسکری کے صاحبزدے ہیں۔دوازدہ امامی حضرات کے عقیدے کے مطابق اس زمانے میں غیبت کبریٰ میں ہیں۔
۲ خط کشیدہ سطریں شعرانی صاحب کی طرف سے ہیں، میری طرف سے نہیں
۳ ضایع، ظاہر کے معنی میں تونہیں استعمال ہوا ہے؟
(عربی عبارتوں کے ترجمے ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کے کیے ہوئے ہیں۔)

علومِ اسلامیہ کی اشاعت میں ہندوستانی مدارس کا کردار
(ایک تاریخی جائزہ)

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

مسجد کو مرکزِ علم بنا کر تعلیم کا جو آغاز عہد نبوی میں مسجد نبوی میں قائم چبوترہ (جسے صفّہ کہا جاتا ہے) سے ہوا تھا، اس کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری تک جاری رہا اور مساجد کے ذریعے تعلیمی سرگرمیاں انجام دی جاتی رہیں۔ اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے۔ محمد بن قاسم (۹۳-۹۶ھ/ ۷۱۱-۷۱۴ء) نے جب سندھ پر حملہ کیا تو کئی مقامات پر مساجد کی تعمیر کی، جو آگے چل کر تعلیم وتعلم کے عظیم مراکز بن گئیں۔ یہی صورت حال ہندوستان کے جنوبی حصے کی بھی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا، خشکی سے اور تری سے۔ خشکی کا راستہ درّۂ خیبر کا تھا جہاں سے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا، لیکن ان سے صدیوں پہلے اہل عرب تاجر اور سوداگر سندھ اور ملیبار (مالابار) سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے اور سالہا سال پہلے کہ اسلام کا کوئی تیغ زن سپاہی اس سرزمین پر قدم رکھے، یہاں مسلمان عربوں اور عراقیوں کی نوآبادیاں قائم ہوچکی تھیں اور مسجدیں تعمیر اور آباد تھیں۔ یہی مسجدیں اسلام کی ابتدائی درس گاہیں تھیں، جن میں وہ بیٹھ کر 'قال اللہ وقال الرسول' کا آوازہ بلند کرتے تھے۔''[۱]

مسلمانوں نے ہندوستان میں دعوت دین کو عام کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے ان میں سے ایک تعلیم گاہوں کا قیام بھی ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی

ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پہنچنے کے ابتدائی زمانے سے ہی تعلیم وتدریس پر خاصا زور دیا اور ہر عہد میں جگہ جگہ بڑے بڑے دارالعلوم بھی قائم کیے۔ یہاں مسلمانوں کے ساتھ نومسلموں اور غیر مسلموں کی بھی تعلیم وتربیت کی جاتی تھی۔ اس کا اثر یہاں کے غیر مسلموں پر بھی پڑا، انہوں نے اپنے علوم کو پھیلانے میں کسی قدر سرگرمی دکھائی اور ان کے ذہن وفکر کے دریچے کھلے۔ اس طرح ان کا علم مسلمانوں کے تعاون سے دوسرے ملکوں میں پہنچنے لگا، جب کہ یہ لوگ مسلمانوں کی آمد سے قبل اپنے علوم کو چھپا کر رکھتے تھے اور ان کے بعض طبقوں کو انھیں پڑھنے پڑھانے کی اجازت نہ تھی۔[۲]

ہندوستان میں مدارس کے قیام کا آغاز

موجودہ شکل کے مدارس کے قیام کا باقاعدہ آغاز پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوگیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) نے بغداد میں ایک بڑا مدرسہ نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا۔ جب کہ دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے قبل الپ ارسلان (۴۵۵-۴۶۶ھ/۱۰۶۳ء-۱۰۷۳ء) اور ملک شاہ (۴۶۶-۴۸۵ھ/۱۰۷۳ء-۱۰۹۲ء) کے عہد حکومت میں سلجوقی سلطنت کے مدارالمہام کی حیثیت سے طوسی کے منظر عام پر آنے سے پہلے کئی مدرسے قائم ہوگئے تھے۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی (۳۹۱-۴۱۸ھ/۱۰۰۰-۱۰۲۷ء زمانہ فتوحات) نے ہندوستان کی دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں صرف کیا۔[۳] سلطان نے غزنی میں ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں 'عروس الفلک' کے نام سے ایک خوب صورت مسجد بنوائی اور اس کے ساتھ مدرسہ کی عمارت بھی تعمیر کرائی۔ نیز مدرسہ کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تعمیر کیا، جہاں نادر اور نایاب قسم کی کتابیں جمع کی گئیں۔ مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے سلطان نے بہت سے دیہات اور اراضی وقف کردیے۔[۴] بادشاہ کے اس ابتدائی اقدام کی دیگر لوگوں نے تقلید کی اور جلد ہی غزنی میں اور کئی مدارس امراء اور ارکان حکومت کی مساعی سے قائم ہوگئے۔ تاریخ فرشتہ میں ہے:

''بادشاہ کی تقلید میں امرائے سلطنت مسجدیں، مدرسے، رباطیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے گئے''۔[۵]

غزنی میں مختصر عرصے میں اس کثرت سے مدرسوں کا قائم ہو جانے کی وجہ سے مختلف ممالک کے علم وفضل کا بڑا طبقہ یہاں پہنچ گیا تھا۔علمی سرپرستی کے ساتھ مورخین محمود غزنوی کے خود صاحبِ علم وفضل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اسے فقہ حنفی کا عالم بتاتے ہیں۔بعض تذکرہ نگاروں نے اس کی تصنیف میں فقہ حنفی کی کتاب 'التفرید' کا بھی ذکر کیا ہے، جس کے بارے میں کم از کم اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کی سرپرستی اور نگرانی میں لکھی گئی تھی۔ ویسے خود اس کی تصنیف ہونے میں بھی کوئی تعجب نہیں، کیوں کہ اس کے دربار میں علمی ومذہبی مباحثے ہوتے رہتے تھے اور وہ ان میں حصہ لیتا تھا۔[۶]

محمود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند سلطان مسعود (۴۲۲-۴۳۳ھ/ ۱۰۳۰ء-۱۰۴۰ء) نے بھی عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں پڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعلیم وتدریس کے سلسلے میں بڑی دل چسپی دکھلائی۔ اس نے اپنی مملکت میں کثرت سے مدارس قائم کیے۔ فرشتہ لکھتا ہے:

''اپنے عہد حکومت کے شروع میں اس نے ممالک محروسہ میں اس قدر مدرسے اور مسجدیں بنوائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز وقاصر ہے۔''[۷]

مولانا عبدالحی الحسنی نے لکھا ہے کہ: ''سلطان مسعود اپنے باپ محمود غزنوی کے طرز عمل پر قائم رہا۔ ابوالریحان البیرونی (م ۴۶۹ھ/ ۱۰۷۷ء) نے 'القانون المسعودی' اور قاضی محمد الناصحیؒ نے فقہ حنفی میں 'الکتاب المسعودی' اور ابو الفضل محمد بن حسین بیہقیؒ (م ۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء) نے 'تاریخ مسعودی' لکھ کر اس کی علم پروری کا اظہار کیا ہے۔''[۸]

اسی طرح سلطان رضی الدین ابراہیم (۴۵۱-۴۸۱ھ/ ۱۰۵۹-۱۰۸۸ء) نے اپنے دور حکومت میں علم وادب کو بڑی تقویت پہنچائی۔اس کے بیٹے علاء الدین مسعود (م ۵۰۸ھ/ ۱۱۱۵ء) نے بھی علوم اسلامیہ کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ معزالدین بہرام شاہ کے عہد میں مولانا نظامی نے 'مخزن الاسرار' لکھ کر اسی بادشاہ کے نام معنون کیا۔ 'کلیلہ ودمنہ' کا ترجمہ بھی اسی عہد میں عربی سے فارسی میں ہوا۔ اسی عہد میں ایک بزرگ شیخ محمد اسمٰعیلؒ لاہور میں وارد ہوئے۔ وہ حدیث وتفسیر کے بڑے عالم تھے۔ بڑی تعداد

میں لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔انہوں نے ایک عرصے تک تعلیم و تدریس کا شغل جاری رکھا۔۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں لاہور ہی میں ان کا انتقال ہوا۔۹

عہدِ غوری کی علمی سرگرمیاں

محمود غزنوی سے لے کر شہاب الدین کے حملۂ ہند تک لگ بھگ دوسو سالوں کا زمانی بعد ہے۔اس درمیان میں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے جو ادارے قائم ہوئے ہوں گے ان کی تعداد خاصی رہی ہوگی۔کیوں کہ اس عہد میں جن مشہور علماء کا ذکر تاریخی کتابوں میں ملتا ہے، ان سے تدریسی خدمات لینے کے لیے صرف مساجد کے صحن کافی نہ تھے، بلکہ مدارس کا قیام بھی ضروری تھا۔بعض تاریخی کتابوں میں فروغ تعلیم کے سلسلے میں شہاب الدین کی جدوجہد کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے:

''وہ ایک بڑا جنگ جو تو تھا ہی،اسی کے ساتھ وہ علوم فنون کا مربی بھی تھا۔اس نے ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں اجمیر فتح کیا اور وہاں متعدد مساجد اور مدارس تعمیر کروائے۔اس کے عہد کی مشہور علمی شخصیت امام حسن بن محمد صغانیؒ غزنوی لاہوری (م۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) کی 'مشارق الانوار' اور 'العیات الزاخر' نے ہندوستانی مسلمانوں کا نام عرب ممالک میں اونچا کیا۔''۱۰

عہدِ غلامان میں تعلیمی اداروں کا قیام

سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام ودوام کا سہرا شہاب الدین غوری (۵۷۱-۶۰۲ھ/۱۱۷۵-۱۲۰۶ء زمانہ فتوحات وحکومت) کے غلام قطب الدین ایبک (۶۰۲-۶۰۷ھ/۱۲۰۶-۱۲۱۰ء) کے سر جاتا ہے۔اس کے اندر دینی حمیت پوری طرح موجود تھی اور شریعت سے حد درجہ لگاؤ تھا۔اس کے تعلقات علماء سے بڑے اچھے تھے۔اس نے علماء کبار ومحدثین عظام کی سرپرستی کی۔اس دینی حمیت اور علماء نوازی کا اثر تعلیمی نظام پر بھی پڑا۔بقول صدرالدین حسن نظامی:''ہر سو میں نوے آدمی عالم اور ہر دس میں نو مفسر قرآن تھے۔''۱۱اس کی مساعی سے متعدد تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں آیا، اگرچہ ان

کی یقینی شہادت نہیں ملتی، سوائے دو چند مدارس کی تعمیر کے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ قطب الدین ایبک نے مدرسے تو ضرور قائم کیے، مگر افسوس ہے کہ ان مدرسوں کے نام باقی نہیں اور یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس درجے کے تھے۔[۱۲] جب کہ دوسرے تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے سلطنت کے مختلف حصوں میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں، جن میں قرون وسطی کے کلیساؤں کی طرح دنیوی تعلیم کا بھی اسی طرح انتظام تھا جس طرح دینی تعلیم کا تھا۔[۱۳]

عہد قطبی میں سب سے پہلے جس تعلیمی ادارہ کے قیام کی شہادت ملتی ہے وہ ناصر الدین قباچہ (م ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کا تعمیر کردہ ہے، اسے ملتان میں مولانا قطب الدین کاشانیؒ کے لیے بنوایا گیا تھا۔ اسی مدرسہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (۵۷۸-۶۶۱ھ/۱۱۸۲/۱۱۸۳-۱۲۶۲ء) نے تعلیم پائی تھی۔[۱۴]

قطب الدین ایبک کا معتمد وزیر بختیار خلجی سلطنت دہلی سے کافی دور بنگال میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا اور قدیم شہر 'ندیا' کی جگہ 'رنگ پور' کے نام سے نیا شہر آباد کیا اور وہاں مسلمانوں کو بسا کر ان کے لیے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔[۱۵]

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے اوائل میں جس مدرسہ کا ذکر تاریخی کتابوں میں کثرت سے ملتا ہے وہ مدرسہ 'معزی' ہے، جسے سلطان التمش/ایلتتمش (۶۰۸-۶۳۳ھ/ ۱۲۱۱-۱۲۳۶ء) نے قائم کیا تھا۔ اسی نام سے بدایوں میں بھی ایک مدرسہ قائم ہوا تھا۔ دونوں مدرسے سلطان معز الدین کے نام سے تھے۔ التمش سلطان معز الدین کی بے حد عزت کرتا تھا۔ مگر رضیہ سلطانہ (۶۳۴-۶۳۷ھ/ ۱۲۳۶-۱۲۳۹ء) کے زمانہ میں اس مدرسہ کی بربادی قرامطہ کے ہاتھوں ہوگئی، جس کو بعد میں فیروز شاہ نے از سر نو تعمیر کرایا اور اس میں صندل کے دروازے لگوائے۔[۱۶] اس مدرسہ کے ایک مدرس مولانا بدر الدین اسحاق بخاریؒ تھے، جو معقول ومنقول میں اپنے وقت کے یکتائے روزگار تھے۔[۱۷]

اس عہد کی علمی ودینی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں: ''سیاسی اعتبار سے جہاں اس کا عہد تاریخ ہند میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے وہاں مذہبی

اور علمی حیثیت سے بھی اس کا عہد نہایت تاب ناک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی ادارہ کی داغ بیل اور نشو ونما اس کی کوششوں کا رہین منت ہے۔''[۱۸]

سلطان التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود (۶۴۴-۶۶۴ھ/ ۱۲۴۶-۱۲۶۵ء) کے عہد میں بھی ایک بڑے مدرسے کے قیام کا پتہ چلتا ہے، جو اسی کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ بادشاہ خود بھی بڑا متقی، دین دار اور صاحب علم وفضل تھا۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدرسہ نے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کے مہتمم اور وقف کے نگراں مولانا منہاج الدین سراج عثمانیؒ مقرر ہوئے تھے، جو طبقات ناصری کے مصنف بھی ہیں۔[۱۹]

اسی عہد میں علاقہ جالندھر میں بھی ایک بڑے مدرسے کے قیام اور اس کی خدمات کا پتا چلتا ہے، جہاں اس کے وزیر اعظم بلبن اور اس کے رفقاء نے کسی مہم سے کامیاب واپسی پر عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی تھی۔[۲۰] بعد میں یہ وزیر خود ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء میں سلطنت دہلی کا بادشاہ بنا اور ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء تک حکومت کرتا رہا۔

عہدِ خلجی کے تعلیمی ادارے

جلال الدین فیروز خلجی (۶۸۹-۶۹۵ھ/ ۱۲۹۰-۱۲۹۵ء) کا عہد ہندوستان میں علمی ترقیوں کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا۔ جلال الدین خود ایک بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ وہ اپنی مجلسوں میں اکثر علم وفن کے بڑے بڑے باکمال لوگوں کو بلاتا اور ان کے علمی مباحثے بڑے شوق اور توجہ سے سنتا تھا۔ اس کی عنایت خاص اور بے لوث فیاضی نے اس کے دربار میں ایک علمی فضا قائم کر دی تھی اور تمام اطراف ونواح میں اس کی فیاضی اور علم دوستی کی شہرت پھیل گئی تھی۔ اس کی سرپرستی میں جن لوگوں نے تاریخ، فلسفہ، شعر وادب اور دوسرے علوم پر تصانیف تیار کیں ان میں ملک الشعراء امیر خسروؒ، خواجہ حسنؒ، تاج الدین عراقیؒ، امیر ارسلان، سعد الدین منطقی، اختیار الدین یاغی اور قاضی مغیث جیسے لوگ تھے۔ دوسرے فرائض کے علاوہ امیر خسرو کے ذمہ شاہی کتب خانہ کا اہتمام بھی تھا۔ سلطان ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس نے انہیں سفید لباس پہننے کا اعزاز عطا کیا تھا، جو صرف خاندان شاہی اور بلند پایہ امرا کا امتیاز تھا۔[۲۱]

علاءالدین محمد خلجی (۶۹۵-۷۱۵ھ/ ۱۲۹۵-۱۳۱۵ء) اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا، مگر وہ علم اور علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ فرشتہ کے مطابق کم وبیش ۴۶ رعلماء اور فضلا ایسے تھے جو اس کے عہد میں مدرسوں میں اساتذہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔۲۲ علائی دروازہ کی جنوبی سمت میں جو کتبہ ہے اس میں سلطان کو علم اور دین کے ستون کو قوت دینے والا اور مدرسوں اور عبادت گاہوں کو تقویت پہنچانے والا مرقوم ہے۔۲۳ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے عوام کی تعلیم وتربیت پر کتنی محنت کی ہوگی۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بے شمار مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں، حمام اور مقبرے تعمیر ہوئے۔۲۴ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جو مدارس تعمیر کروائے وہ کس نام سے تھے اور بادشاہ نے ان مدرسوں کو کن بزرگوں کے نام سے معنون کیا تھا؟

'مدرسہ ومقبرہ علاءالدین خلجی' جو مدرسہ قوۃ الاسلام اور قطب کی لاٹ کے متصل واقع تھا، سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۷۱۶-۷۲۰/ ۱۳۱۶-۱۳۲۰ء) نے تقریباً ۷۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء میں بنوایا۔ مقبرہ، مدرسہ اور مسجد سب کی مرمت فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں کی، صندل کے چھپر کھٹ چڑھائے۔۲۵

عہدِ تغلق میں مدرسوں کا قیام واستحکام

محمد شاہ تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ/ ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے عوام کی تعلیم وتربیت میں خاصی دل چسپی لی۔ اس نے مکتبوں میں ہزاروں علماء وفقہاء درس وتدریس کے لئے مقرر کیے، جو بچوں کو پڑھاتے تھے اور انہیں شاہی خزانہ سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ مورخین نے علم وادب میں اس کی گہری دل چسپی کی شہادت دی ہے۔۲۶

فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ/ ۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے نہ صرف پرانے مدرسوں کی، جو بہت خراب اور خستہ حالت میں پڑے ہوئے تھے، مرمت اور ان کی دوبارہ تعمیر کرائی، بلکہ بہت سے نئے مدرسے بھی قائم کیے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق اس نے اپنی

مملکت میں تیس مدرسے قائم کیے اوران میں لائق وفائق اور باتنخواہ اساتذہ رکھے۔جب کہ عبدالباقی خاں نے مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے پچاس مدرسے کھلوائے۔ ۲۷ فیروز شاہ کی علمی سرگرمیوں کا ذکر اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس طرح کیا گیا ہے:

''تغلق خاندان میں فیروز شاہ تغلق علم پرور،علم دوست، علماء کا قدرداں اور سرپرست تھا۔وہ خود بھی تصنیف وتالیف سے شغف رکھتا تھا۔اس نے اپنی خودنوشت سوانح 'فتوحات فیروز شاہی' کے نام سے لکھی ہے۔فیروز شاہ نے ۷۵۳ھ/ ۱۳۵۲ء میں ایک مدرسہ فیروز آباد میں قائم کیا،جس کے متصل مسجد بھی تھی۔ضیاء برنی نے اس مدرسے کی بڑی تعریف کی ہے۔دوسرا مدرسہ بالا بند آب سیری تھا جو ایک شاہی عمارت میں واقع تھا..... اس نے رفاہ عامہ کے جو ادارے قائم کیے تھے،جن میں مدارس بھی تھے، ان کی تفصیل فتوحات فیروز شاہی میں ص ۳۸۲ تا ۳۸۴ مذکور ہے۔'' ۲۸

ان میں سب سے عظیم الشان وہ مدرسہ تھا جو'مدرسہ فیروز شاہی' کے نام سے مشہور ہوا۔اس مدرسہ کی تفصیلات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان بادشاہ کے نزدیک ایک تعلیمی ادارے کے کیا مقاصد تھے اور اس کا اندرونی نظام کیسا تھا؟ یہ ایک بڑا اور وسیع محل تھا جس کے چاروں طرف نہایت عمدہ باغات تھے اوراس کے اندر باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کے لیے،جن کی اکثر آمد ہوا کرتی تھی،علیحدہ مکانات بنے ہوئے تھے۔یہ ایک اقامتی درس گاہ تھی،جس کے ساتھ غریب طلبا اوراساتذہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔اس میں ایک مسجد اور پانی کا حوض بھی بنوایا گیا تھا۔ ۲۹ اس مدرسہ کے منتظم وناظم مولانا جلال الدین رومیؒ تھے۔

دہلی میں ایک اور مدرسہ 'حوض خاص' کے نام سے مشہور تھا۔حوض دراصل سلطان خلجی کا بنوایا ہوا تھا۔اسے اس نے اپنی تخت نشینی کے سال ۶۹۶ھ/ ۱۲۹۷ء میں بنوایا تھا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا۔ بادشاہ نے اس کو صاف کروایا اور جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی کرائی۔تقریباً ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں اس نے اس کے اوپر ایک مدرسہ قائم کیا اوراس میں مشہور مدرسین جمع کیے۔اس مدرسہ کے صدر مدرس سید

یوسف بن جمال حسینیؒ تھے، جن کا انتقال ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء میں ہوا اور اسی مدرسہ کے صحن میں دفن کیے گئے۔[۳۰]

فیروز شاہ تغلق نے اپنے عزیز بیٹے اور ولی عہد فتح خاں کی یادگار میں ایک اور مدرسہ قائم کیا تھا، جس کے ساتھ ایک مسجد اور تالاب بھی تھا۔[۳۱] اس مدرسہ کے اخراجات کا مدار شاہی وظائف پر تھا۔

فیروز شاہ کے عہد میں شاہی خزانے کی ایک بڑی رقم غلاموں کی تعلیم و تربیت پر صرف ہوتی تھی۔ ان کی بہبود کے کاموں کے لیے جو عملے اور افسران مقرر تھے ان کا ایک علیٰحدہ محکمہ تھا اور ان کی پنشن اور وظائف مقرر تھے۔ ان غلاموں کی تعداد ۱,۸۰,۰۰۰ کے قریب تھی اور کوئی فن اور ہنر ایسا نہ تھا جس میں ان کی تربیت کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔ ایک وقت میں ۱۲/ ہزار ماہرین فن نکالے جاتے تھے۔[۳۲]

سلاطینِ لودھی کی علمی دل چسپی

سلطنت لودھی میں بھی تعلیم و تعلم کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ سلطان سکندر لودھی (۸۹۴-۹۲۳ھ/ ۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) نے آگرہ کو دارالسلطنت بنانے کے بعد پورے شہر اور قرب و جوار میں علم و فن کو ترقی دی، جس کی وجہ سے شہر دہلی کی رونق ماند پڑ گئی۔ اس نے وہاں جو عالی شان عمارت بنوائی اس میں مدرسے بھی قائم کیے۔ اس کی علمی فیاضی کو دیکھ کر عرب، ایران اور بخارا سے علماء و فضلا آنے لگے۔ اس کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصہ میں آگرہ ایک بڑا تعلیمی مرکز بن گیا۔ ابوالحسنات ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''سکندر لودھی نے اپنے ایام حکومت میں بہ کثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں بنوائیں، متھرا میں اس نے متعدد مدارس قائم کیے۔''[۳۳] بادشاہ کی علمی دل چسپی اور علماء پروری کا تذکرہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''لودھی خاندان کا گل سرسبد سلطان سکندر لودھی تھا۔ اس کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی زبان کی طرف توجہ کی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ مکاتب و مدارس میں تعلیم پانے

لگے۔اسی زمانے میں سید رفیع الدین شیرائیؒ گجرات سے دہلی وارد ہوئے ۔موصوف معقولات میں محقق دوانی اور حدیث میں حافظ سخاویؒ کے شاگرد رشید تھے۔انہوں نے آگرے میں سکونت اختیار کرکے درس وتدریس کا بازار گرم کیا اور ایک عالم کو اپنے فیوض وبرکات سے مستفید کیا۔''۳۴

مولانا عبداللہ تلنبیؒ جب لاہور کی بربادی کے بعد دہلی پہنچے تو سکندر لودھی نے ان سے دہلی میں قیام کرنے کی درخواست کی۔مولانا نے یہاں قیام کرکے نہ صرف جدید تعلیمی نصاب مرتب اور اسے مدرسہ کے نصاب میں شامل کیا، بلکہ ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا،جس کا نام'مدرسہ عبداللہ تلنبیؒ' رکھا گیا۔آپ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔'بدیع المیزان' اور'شرح میزان' آپ کی تصنیفات ہیں۔ ان کے انتقال ۹۲۲ھ/۱۵۵۶ء کے بعد سکندر لودھی کے رہبر شیخ بہوہ نے شاہ عبدالرزاق جھنجھانویؒ کو اس مدرسہ میں درس وتدریس کے لیے مامور کیا۔۳۵

عہدِ ہمایونی کے تعلیمی ادارے

ہمایوں(۹۳۷-۹۶۳ھ/۱۵۳۰-۱۵۵۶ء درمیان میں کچھ وقفہ) نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسینؒ تھے۔لوگوں کو عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمایوں کے مقبرہ کے اوپر جو چھت تھی وہ دراصل ایک مدرسہ تھا،جس میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت تعلیم دیتے تھے اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلبہ کی اقامت کے لیے بنے ہوئے تھے۔۳۶ یہ مدرسہ دہلی مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔اسی طرح شیخ زین الدین خانی نے ایک مدرسہ دہلی میں تعمیر کیا تھا،ان کے انتقال کے بعد بطور ایصال ثواب آگرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔۳۷

دہلی کے علاوہ نظام الدین کی سڑک کے بائیں طرف مدرسہ'خیر المنازل' کی عالی شان اور وسیع عمارت تھی۔ یہاں ایک مسجد بھی تھی۔یہ مدرسہ اور مسجد اکبر بادشاہ کی رضاعی والدہ ماہم بیگم (جو ادھم خاں کی سگی ماں تھی) نے ۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء میں تعمیر کرائی تھی ۳۸

اور اسے نہایت ساز وسامان اور لائق اساتذہ سے آراستہ کرایا تھا۔۳۹ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نے 'اخبار الاخیار' میں غالباً اسی مدرسہ کا ذکر کیا ہے، جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔۴۰

اس عہد میں ایک اور مدرسہ دہلی میں تھا جو 'خواجہ معین الدین' کا مدرسہ کہلاتا تھا۔ اس میں طلبا کی تعلیم کے لیے ماہر اساتذہ رکھے گئے تھے۔ ایک استاد مرزا مفلس سمرقندیؒ بھی تھے جو اس مدرسہ میں تین سال (۹۷۹-۹۸۲ھ/ ۱۵۷۱-۱۵۷۴ء) تک کام کرتے رہے۔۴۱

عہدِ اکبری میں تعلیم وتدریس کی ترقی

مغل بادشاہ اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ/ ۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نے فتح پور سیکری اور اس کے ارد گرد کے علاقے میں اپنی رعایا کی خوش حالی اور عمدہ تعلیم وتربیت کے لیے بہتر اقدامات کیے۔ اس کے حکم سے تدریس کے طریقے میں بھی تبدیلی کی گئی اور بچوں کو منصوبہ بند طریقے سے تعلیم دینے کا رواج شروع ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۶-۱۳۷۸ھ/ ۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) اس عہد میں علما کی کثرت اور ان کے فیوض وبرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس عہد کے ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے کوئی نہیں بستا، کوئی شہر وقریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔''۴۲ خود بادشاہ نے فروغ تعلیم کے سلسلے میں جو اقدامات کیے اس کے متعلق عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

''اکبر نے اپنی ہندو اور مسلم رعایا کی تعلیم کا انتظام شاہان سابق سے بہت بڑھ چڑھ کر کیا۔ قلم رو کے مکاتب ومدارس میں ہندو اور مسلم طالب علم اکٹھے پڑھتے تھے۔ فارسی پڑھانے کا انداز اس قدر صحیح اور سائنٹفک تھا کہ چند ہفتوں کے اندر طالب علم فارسی نثر ونظم روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ باعتبار علوم تعلیم کی ترتیب یہ تھی: اخلاق، ریاضی، حسابات، زراعت، ہندسہ، ہیئت، علم الارض، معاشیات، سیاست ملکی، طبیعیات، منطق، فلسفہ، فطرت، مجرد ریاضیات، دینیات اور تاریخ۔ ہندو طلبا ویاکرن (صرف ونحو) ویدانت اور پاتنجلی پڑھتے تھے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نظام تعلیم میں تبدیلیوں کی وجہ سے مکاتب ومدارس قلم

رو کے لیے زیب وزینت کا سامان بن گئے تھے۔آئے دن قلم رو کے مختلف حصوں میں نئے نئے مکاتب اور بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جارہے تھے۔ فتح پور سیکری کی پہاڑی پر اکبر نے ایک اتنا بڑا مدرسہ قائم کیا کہ سیاح کوئی نظیر نہ پیش کرسکتے تھے۔اس کے علاوہ شہر میں بے شمار دوسرے مدرسے بھی تھے، جو شہنشاہ کے حکم سے بنائے گئے تھے۔آگرہ میں بہت سے مدرسے تھے جن میں تعلیم وتدریس کے لیے شیراز سے معلمین طلب کیے جاتے تھے، کیوں کہ شیراز اس زمانے میں مسلمانوں کے علوم کا مشہور مرکز تھا''۔۴۳

عہدِ جہاں گیری کے مدرسے

جہاں گیر (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ/۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) نے اپنے عہد میں ایک عام حکم جاری کیا کہ جو امیر یا دولت مند سیاح لاوارث فوت ہوجائے اس کی املاک متروکہ بحق شہنشاہ ضبط کرکے اسے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر ومرمت پر صرف کیا جائے۔۴۴ اس فرمان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مدارس ومکاتب کی تعمیر وترقی میں کتنی دل چسپی لیتا تھا۔

جہاں گیر نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے لیے ان کے نام سے ایک مدرسہ بنایا اور باضابطہ طور سے اس کے لیے زمین وقف کی۔ شیخ نے اس میں مدتوں درس دیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد میں مفتی نورالحق صاحبؒ، شیخ علی صاحبؒ، شیخ محمد ہاشم صاحبؒ اور ان کے نواسے ابورضا بن اسمعیلؒ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس میں سلسلہ وار درس جاری رکھا۔ ہر دور میں اس مدرسہ سے علماء کی ایک جماعت نے سند حاصل کی ہے۔۴۵

جہاں گیر کے عہد میں یقیناً اور بھی مدرسے قائم ہوئے ہوں گے اور پرانے مدرسوں کی کفالت شاہی اخراجات سے ہوتی ہوگی، مگر اس سلسلے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ ان کے علاوہ عوام بھی مدارس کی تعمیر کے لیے جدو جہد کرتے تھے اور ان کے اخراجات کی کفالت کرتے تھے۔جیسا کہ تاریخِ شاہ جہاں کا مصنف لکھتا ہے:

''عہد جہاں گیر میں ہر شہر اور گاؤں میں مدرسے تھے۔ یقیناً یہ مدرسے سرکاری امداد کے پروردہ نہ تھے ۔ضرور ہے کہ ان کا وجود مقامی وذاتی کاوشوں کا رہین منت

ہوگا۔علاوہ بریں اس دور میں تعلیم دنیوی جدو جہد کے دائرہ سے بالکل باہر سمجھی جاتی تھی۔یہ کام گوشہ نشیں عابدوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔یہ بزرگان دین تعلیم مفت دیتے تھے یا نام نہاد اجرت لیتے تھے۔مذہبی رہ نماؤں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے لاہور،احمد آباد، برہان پوراور جون پور میں پائے جاتے تھے۔''[۴۶]

اس عہد کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (۹۷۱-۱۰۳۴ھ/ ۱۵۶۴-۱۶۲۴ء) کی تحریک سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے بڑی تعداد میں اپنے خلفاء کو ملک کے مختلف حصوں میں اور بیرون ملک روانہ کیا،جنہوں نے تعلیم وتدریس اور تربیت خلق کو مقصد زندگی بنایا۔یقیناً ان میں کچھ لوگوں نے مدرسوں کا رخ کیا ہوگا اور کچھ لوگوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے ہوں گے۔خود مجدد الف ثانی نے جہاں گیر سے عہد لیا تھا کہ وہ شریعت اسلامی کو سلطنت میں فروغ دینے کی کوشش کرے گا۔[۴۷] اس عہد کا بھرم رکھنے کے لیے بادشاہ نے قابل قدر امور انجام دیے ہوں گے اور بڑی تعداد میں مدارس ومکاتب اور مساجد کی تعمیر کی ہوگی اوران میں لائق وفائق علما اور بزرگان دین کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

مدرسوں کے قیام واستحکام سے شاہ جہاں کی دل چسپی

شاہ جہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ/ ۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) نے مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی تعمیر کروائی۔مسجد فتح پوری کا مدرسہ اسی دور کے باقیات صالحات میں سے ہے۔ مسجد اکبر آبادی، جو حوادث روزگار کی نذر ہوگئی اسی میں شاہ عبد القادر دہلویؒ (۱۱۶۷-۱۲۳۰ھ/ ۱۷۵۳-۱۸۱۴/۱۵ء) کا قیام رہا۔مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) اور مولانا فضل حق خیر آبادیؒ (م ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے اسی مسجد میں تحصیل علم کی تھی۔[۴۸]

شاہ جہاں نے ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء میں جامع مسجد دہلی کے قریب شمالی رخ پر شاہی شفاخانہ قائم کیا،جس کا نام 'دارالشفا' رکھا۔یہاں غربا اور مساکین کے علاج کے تمام اسباب مفت مہیا کیے جاتے تھے۔مسجد کے جنوبی رخ پر اس نے ایک شاہی مدرسہ قائم کیا،جس کا نام 'دارالبقاء' تھا۔اس کا سال بنا تخمیناً ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۴۹ء ہے۔[۴۹] اسی مدرسہ کو

مفتی صدرالدین آزردہ (م۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) نے دوبارہ زندہ کیا اور اس کے اخراجات بھی اپنے ذمے رکھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں نے ان کی جائیداد ضبط کر لی تو یہ مدرسہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔۴۹

عہد شاہ جہانی میں سیال کوٹ بھی علوم دینیہ کا بڑا مرکز تھا۔ یہیں مولانا عبدالحکیم سیال کوٹیؒ (م۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۶ء) کا مدرسہ تھا، جو سب سے زیادہ مشہور تھا، اس کے مصارف کے لیے شاہ جہاں نے کئی گاؤں وقف کر دیے تھے۔۵۱

شاہ جہاں کے اندر شروع سے ہی دینی حمیت اور شریعت کی پاس داری بڑی حد تک موجود تھی۔ اس کے عہد میں جگہ جگہ مدارس قائم تھے اور علماء مسند درس بچھائے ہوئے تھے۔ اس عہد کی علمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتے ہیں:

''شاہ جہاں کے عہد میں سرہند، تھانیسور اور انبالہ میں ایسے مشہور و معروف قابل و عالم حضرات رہتے تھے جن سے اکتساب علم کے لیے دور دراز سے طالب علم آیا کرتے تھے۔''۵۲

اس کے علاوہ بعض شہادتوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں جو قدیم مدرسے حوادث زمانہ کی وجہ سے چرند و پرند کے مسکن بن گئے تھے اور ان کی طرف لوگوں کی توجہ نہ ہوتی تھی، انہیں بادشاہ نے پھر سے آباد کروایا اور ان میں اچھے اچھے معلمین رکھوا کر تعلیم و تدریس کا کام شروع کیا۔۵۳

اورنگ زیب عالم گیر کے علمی ذوق کے اثرات

سلاطین ہند میں اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ/ ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کو جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے ان میں سے ایک اس کا تعلیمی ذوق بھی ہے۔ وہ خود بہت پڑھا لکھا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی بہتر تعلیم کے لیے پوری سلطنت میں بے شمار چھوٹے بڑے مدارس و مکاتب قائم کیے، علماء و مدرسین کو جاگیریں عطا کیں اور طلباء کے لیے وظیفے مقرر کیے۔۵۴ عہد عالم گیری میں دو طرح کے مدرسے تھے: ایک وہ جن کے پورے مصارف حکومت کی طرف سے ادا کیے جاتے تھے اور ان کا انتظام و انصرام بھی اسی

سے متعلق تھا۔ دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علماء دین کی کوششوں سے چل رہے تھے۔ بہتر نظام تعلیم کے لیے اورنگ زیب نے دوسرے صوبوں کے گورنروں کے نام شاہی فرامین جاری کیے جن میں رعایا کی بہتر تعلیم کی سخت تاکید کی۔۵۵ فروغ تعلیم کے سلسلے میں بادشاہ کی سرگرمیوں کا ذکر اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس انداز سے کیا گیا ہے:

''اس نے ہر طرف مدارس قائم کرنے کے علاوہ جہاں جہاں معلمین وعلماء تھے، ان کے لیے بہ کثرت مدد معاش کی رقمیں مقرر کیں۔ لاہور کی شاہی مسجد اور وزیر خاں کی مسجد مدرسے کا کام دیتی تھیں۔ وزیر خاں کی مسجد کے نیچے اور گردو پیش جو دکانیں تھیں ان سے مدرسے کے مصارف پورے ہوتے تھے۔''۵۶

لکھنؤ میں فرنگی محل کا دار العلوم مدرسہ نظامیہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ملا نظام الدینؒ (م ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۷ء) کو ایک عظیم الشان مکان عنایت کیا، جو فرنگی محل کے نام سے مشہور تھا۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں کا ترتیب دیا ہوا نصاب تعلیم تقریباً تین صدیوں سے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں جاری ہے۔ اس مدرسہ کے علمی فیضان پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالعرفان ندویؒ لکھتے ہیں:

''نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں یہ فخر صرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ تقریباً ڈھائی سو برس تک بلا فصل علماء وفضلاء پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی محض علم وفن کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور ان کی درس گاہوں سے ہزاروں علماء نکل کر ملک کے ہر گوشہ میں پھیل گئے اور الحمدللہ کہ یہ فیض اب تک جاری ہے۔''۵۷

اسی مدرسہ کے فیض یافتہ ملا حسنؒ (م ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۴ء) مولانا عبد العلی (م ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) مولانا عبد الحکیمؒ (م ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) اور آخر میں مولانا عبد الحیؒ (م ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) وغیرہ نے نہ صرف درس وتدریس کی سند کو زینت بخشی ہے، بلکہ تصانیف اور خصوصاً درسی کتابوں کی شروح وحواشی کے ذریعہ بھی بیش بہا علمی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی گونج سے مدارس عربیہ کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔۵۸

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ/ ۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے والد اور فقاوی

عالم گیری کے مرتب ومولف شاہ عبدالرحیمؒ (۱۰۵۳-۱۱۳۱ھ/۱۶۴۴-۱۷۱۸ء) نے مہندیان دہلی میں ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں 'مدرسہ رحیمیہ' کی بنیاد ڈالی، درس وتدریس کا شغل جاری کیا اور فقہ، تصوف، کلام وفلسفہ کے علاوہ قال اللہ وقال الرسول کی آواز بھی بلند کی ۔اسی درس گاہ سے ان کے لائق فرزند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تعلیم وتربیت حاصل کی اور پھر وہیں درس دیا۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے مشہور ومعروف جید علماء نے یہاں تعلیم پائی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء)، شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۵۹ھ- ۱۲۳۹ھ/ ۱۷۴۶-۱۸۲۴ء)، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ محمد اسحاقؒ (۱۱۹۷-۱۲۶۲ھ/ ۱۷۸۳-۱۸۴۶ء)، شاہ عبدالقادرؒ (م ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۲۸ء)، شاہ محمد عاشق پھلتیؒ (م ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء)، شاہ نوراللہ پھلتیؒ، شاہ اہل اللہؒ، خواجہ محمد امین کشمیریؒ اور اخوان محمد سعیدؒ وغیرہ یہیں کے فیض یافتہ ہیں۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں سے حدیث نبوی کی برکات ہندوستان کے تمام گوشوں میں پھیلیں۔ اس مدرسہ کی یادگار اب بھی دلی میں باقی ہے۔ ابتداء میں اس مدرسہ کا کوئی نام نہ تھا، بعد میں یہ مدرسہ اپنے بانی کے نام نامی سے منسوب ہوکر 'مدرسہ رحیمیہ' کہلایا جانے لگا۔ آگے چل کر یہ مدرسہ صرف ایک درس گاہ ہی نہیں رہا، بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس نے پورے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے منظّم اقدام کیا ہے۔۵۹

اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد میں مدرسہ 'غازی الدین' قائم ہوا۔ غازی الدین اورنگ زیب کے عہد میں ایک محبوب افسر تھے اور ان کا شمار ممتاز لوگوں میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے دہلی میں اجمیری دروازہ کے پاس ایک مدرسہ، ایک مسجد اور ایک مقبرہ بنوایا، یہ تینوں چیزیں ایک ہی احاطہ کے اندر تھیں۔ اس احاطہ میں طلبہ کی رہائش کے لیے بہت سے کمرے بھی تھے۔ یہی مدرسہ آگے چل کر دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا، جو عیسائی مبلغوں کا مرکز بن گیا تھا۔ پھر یہ کالج ذاکر حسین کالج میں منتقل ہوگیا اور آج اسی نام سے جانا جاتا ہے۔۶۰

اسی مدرسہ میں ہندوستان کی معروف اور قابل ہستیوں نے تعلیم حاصل کی، جو

آگے چل کر مجاہدین آزادی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۳۲-۱۸۸۰ء)، سرسید احمد خاںؒ (۱۲۳۳-۱۳۱۶ھ/ ۱۸۱۷-۱۸۹۸ء)، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء)، مولانا یعقوب نانوتویؒ (م ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء) منشی ذکاء اللہؒ (م ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء)، ڈپٹی نذیر احمدؒ (م ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء)، مولوی کریم الدین پانی پتیؒ، مولوی ضیاء الدینؒ، مولانا احسن نانوتویؒ (۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء)، میر ناصر علیؒ، مولانا فضل الرحمان دیوبندیؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) پیرزادہ محمد حسینؒ، مسٹر آصف علی بیرسٹر، ماسٹر جانکی پرشاد، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ (۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) وغیرہ یہیں کے پروردہ ہیں۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں مرزا احمد، مولوی رشید الدینؒ (۱۲۴۳ھ/ ۱۸۷۴ء) مولوی مملوک علیؒ (۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء) مولانا ضیاء الدینؒ، مولانا امام بخش صہبائیؒ (م ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) وغیرہ مشہور ہیں۔[۶۱]

ان مدارس کے علاوہ اور بھی بہت سے مدارس تھے جو ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت میں مشغول ومنہمک تھے اور مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ علماء و بزرگان دین کی خانقاہیں تھیں جہاں سے تشنگان علم اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ مگر جب انگریزی سامراج کا ہندوستان پر اقتدار قائم ہوا تو حالت یکسر بدل گئی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کے ساتھ ان مدارس ومعابد اور قدیم خانقاہوں کو بھی نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

دار العلوم دیوبند کے قیام کے اسباب ومحرکات

اگرچہ دہلی کالج (مدرسہ غازی الدین) کو انگریزوں نے اپنے تبلیغی مشن کا محور و مرکز بنالیا تھا، لیکن آگے چل کر یہیں کے اساتذہ اور طلبہ نے ان کے خلاف محاذ آرائی کی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جب انگریزوں کا پورے ملک پر قبضہ ہوگیا اور حکومت نے جگہ جگہ مسلمانوں کے مدارس ومعابد پر چھاپے مارے اور انہیں ویران و برباد کیا، تو مذکورہ کالج کے فضلاء اور دیگر ہمدردان ملت نے مل کر اس ناکامی پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا اور اس کی تلافی اور مسلمانوں کے تشخص اور اسلامی علوم کی نشر

واشاعت کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارہ کے قیام کو ضروری سمجھا جو گزشتہ تمام ناکامیوں کی تلافی کر سکے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی میں اہم کردار ادا کرے۔ چنانچہ اس تحریک کے روح رواں حاجی امداد اللہ (م ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) اور ان کے رفیق مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں ایک مدرسہ کی بنیا درکھی۔ اس مدرسہ کا آغاز چھتہ کی مسجد سے ہوا اور اس کا نام 'دارالعلوم' رکھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایشیا میں دینی تعلیم کا عظیم ادارہ بن گیا۔ اس کی مقبولیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے 'تاریخ دارالعلوم' کے مصنف محبوب رضوی لکھتے ہیں:

''دار العلوم دیوبند صرف ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت ایک موثر اور فعال تحریک ہے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کے خس و خاشاک کو جدا کر کے ان کو صاف اور بے میل اسلام سے روشناس کیا۔ شرک اور توہمات سے انہیں نجات دی۔ مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کر کے سیاسی اعتبار سے انہیں اس لائق بننے میں مدد بہم پہنچائی کہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کر سکیں۔ تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنی عظیم الشان خدمات کا نقش قائم نہ کیا ہو۔ اس تحریک کی افادیت صرف اندرون ملک تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ دور دور تک اس کے حلقۂ اثر کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اس لیے صرف برصغیر ہی کا نہیں، بلکہ ایشیا کا بھی دارالعلوم دیوبند ایک انقلاب آفریں مرکز بن گیا۔''[۶۲]

اس تعلیمی مرکز نے ایک طرف انگریزوں کے مظالم کو روکنے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے بڑے بڑے مجاہدین آزادی پیدا کیے تو دوسری طرف یہاں سے ایسے داعیان دین بھی نکلے جنھوں نے عیسائیت کی تبلیغی مساعی پر کاری ضرب لگائی اور اسلام سے متعلق شکوک وشبہات، الزامات اور بہتان تراشیوں کا پردہ فاش کیا۔ اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کار نے عیسائیوں اور ہندو پنڈتوں سے مختلف مقامات پر مناظرے و مباحثے کیے اور ان کو شکست دے کر اسلام کے رخ زیبا کو تابناکی بخشی۔ انہوں

نے جو مناظرے اور مباحثے کیے وہ کتابی شکل میں 'انتصار الاسلام'، 'تقریر دل پذیر'، 'قبلہ نما'، 'میلہ خدا شناسی' اور 'مناظرہ رڑکی' وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔۶۳

دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تربیت یافتہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (م۱۳۹۳ھ/۱۹۲۰ء) نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے بڑی جدوجہد کی، جس کے نتیجے میں انہیں اذیت ناک سزا سے دوچار ہونا پڑا اور مدتوں مالٹا کی جیل میں قید و بند کی زندگی گزاری۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور

دار العلوم دیوبند کے اثرات مختصر عرصے میں دور دور تک پھیلے تو ہمدردان ملت کے اندر مزید داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ دینی تعلیمی ادارے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ چنانچہ دار العلوم کے قیام کے تقریباً ۶/ ماہ بعد ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں سہارن پور میں مدرسہ مظاہر علوم قائم ہوا۔۶۴ اس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتوی نے رکھی۔۶۵ اس مدرسہ کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارن پوری، جو مسلم الثبوت فقہا میں تھے، اپنے دولت کدہ پر قدیم رواج کے موافق شائق طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا عنایت الٰہی صاحب، مولانا الحاج قمر الدین صاحب جو آج مشائخ وقت ہیں، اس زمانہ میں حضرت مولانا سعادت علی صاحب کے پاس طالب علمی کے منازل طے کر رہے تھے اور مولانا کے مخصوص تلامذہ میں سمجھے جاتے تھے۔ مولانا کو اکثر دینی مدرسہ کی بنیاد کا ولولہ رہتا تھا اور گاہ بہ گاہ اس کا ذکر تذکرہ بھی فرماتے رہا کرتے تھے۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کے علم میں اس کے لیے یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ کی تاریخ مقرر تھی۔ چنانچہ عرصہ کے ذکر تذکرہ اور تمنا و خواہش کے بعد دفعۃً تاریخ مذکور میں مولانا کو جوش و ولولہ پیدا ہوا اور چوک کی مسجد میں مدرسہ کی بنیاد ڈال دی۔ مولانا سخاوت علی انبہٹوی کو جو پہلے انبہٹہ میں پڑھایا کرتے تھے..... مدرس عربی مقرر فرمایا، جنہوں نے مولانا عنایت علی صاحب، حافظ الحاج قمر الدین

صاحب، محمد علی مقبول احمد صاحب وغیرہ طلبا کو نحو میر شروع کرائی۔ ان لوگوں کے کچھ اسباق مولانا سعادت علی صاحب کے پاس بھی متفرق طور پر ہوتے تھے، جو مولانا نے خود ہی پڑھانے شروع فرمادیے تھے..... مدرسہ کی بنیاد پڑتے ہی متفرق نواح سے طلبا کی رجوعات شروع ہوئیں۔ اس بنا پر مولانا کو ایک مدرس کا فوراً اضافہ کرنا پڑا۔ چنانچہ شوال ۱۲۸۳ھ سے حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز مدرس مقرر ہوئے۔''[۶۶]

اس مدرسہ کا طرز تعلیم دیوبند جیسا تھا، اور جس کی بنیاد خاص طور سے نظامی نصاب پر رکھی گئی تھی۔ البتہ یہاں ایک خاص انداز میں علم حدیث کو پڑھانے پر زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسہ نے علم حدیث کی تعلیم اور اشاعت کے میدان میں نمایاں خدمت انجام دی اور کئی معرکہ آرا کتابیں حدیث پر تحریر کرکے اس علم کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مدرسہ کے سرپرستوں اور نگراں اعلی میں مولانا محمد علی، مولانا مظہر، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حافظ سید عبد اللطیف، مولانا اسد اللہ، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم، مولانا عبد الرحیم رائے پوری اور شیخ الحدیث مولانا زکریا کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔[۶۷]

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں مولانا محمد علی مونگیری (۱۲۶۲-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) کی دعوت پر کان پور میں علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین طالب آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی (م۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء)، مولانا خلیل احمد سہارن پوری (م۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء)، مولانا ثناء اللہ امرتسری (م۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) مولانا محمود حسن، حکیم فخر الحسن گنگوہی، شاہ سلیمان پھلواروی (م۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) اور دوسرے علماء شریک ہوئے۔[۶۸] اس اجتماع میں مذہبی تعلیم کے موجودہ طریقے کو بہتر بنانے، مذہبی تعلیم دینے والے مختلف تعلیمی اداروں کے درمیان خیر سگالی لانے اور لائق علماء کے مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے طور طریقوں پر غور کیا گیا۔ ان کے سامنے

مقصد یہ تھا کہ ایسے علماء تیار کیے جائیں جو دنیا کے سامنے موثر طریقہ پر اسلام کی تصویر کو پیش کرسکیں۔۶۹ نتیجہ میں ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس میں نہ صرف مذہبی اور زمانی علوم کی تعلیم کا انتظام ہو بلکہ ٹیکنیکل ٹریننگ کا بھی بندوبست ہو۔ بنیادی مذہبی پہلوؤں کے ساتھ کسی سمجھوتہ کے بغیر تعلیم کے جدید رجحانات کی روشنی میں نصاب تعلیم تیار ہو۔تا کہ طلبا اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔۷۰ دارالعلوم ندوۃ العلما نے تو کافی حدتک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی ،مگر اس 'تحریک' کو، جس کے لیے اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تھا،بہت زیادہ وسعت اور عمومیت حاصل نہ ہوسکی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''اس تحریک کو قدیم وجدید دونوں طبقوں کا (اس وسیع خلیج کی وجہ سے جوان کے درمیان حائل تھی) وہ موثر و پرجوش تعاون حاصل نہ ہوسکا جس کی وہ مستحق تھی، اس کا بڑا سبب ان اہل فکر واہل دعوت کی کمی تھی جو ان دونوں ثقافتوں کے حامل ہوں اور دونوں کو اچھی طرح ہضم کرچکے ہوں اور ان اجزا سے جو بہ ظاہر متضاد نظر آتے ہیں، ایک پاکیزہ، معتدل، خوش گوار اور مفید 'آمیزہ' بناسکتے ہوں جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں اور درختوں سے حاصل کرکے شہد تیار کرتی ہے۔''۷۱

اس تحریک کے اثرات ونتائج سے ہٹ کر دارلعلوم ندوۃ العلما کے مقصد قیام پر غور کیا جائے تو یہ فیصلہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے کہ اس نے دینی نظام تعلیم کی قدامت سے پرے ہوکر جدید اسلوب میں اسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بانیان اور فضلاء نے نہ صرف درس وتدریس میں نیا انداز اپنایا، بلکہ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی مثبت فکر کی عکاسی کی۔مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلما کی تحریک کے رہنماؤں اور اس درس گاہ کے متعدد فضلاء نے اسلامی ثقافت کی نشرواشاعت ،سیرت نبوی کی تحریر وتدوین ،اسلام کے کارناموں اور اس کی تعلیمات کو جدید علمی اور ادبی اسلوب میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔علامہ

شبلی نعمانی (۱۲۷۳ھ-۱۳۳۲ھ/ ۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی علمی وادبی تحریرات بالخصوص ان کی عظیم کتاب سیرت النبی، الفاروق، الغزالی، مولانا جلال الدین رومی اور ان کے متکلمانہ اور مورخانہ مضامین نے ہندوستان کی جدید نسل کو متاثر کیا اور اس کے احساس کہتری کے دور کرنے میں مفید خدمت انجام دی۔ اسی طرح ان کے شاگرد رشید و جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ 'سیرت النبی' کی چار جلدیں سیرت نبوی اور علم کلام کا ایک قیمتی کتب خانہ ہے۔ان کی کتاب 'خطبات مدراس' سیرت کی موثر ترین کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اسی طرح ان کے محققانہ علمی وادبی مضامین نے اسلامی کتب خانہ کو مالامال کیا۔انہوں نے اور ان کے بعض رفقا نے ملک کی علمی ،ادبی اور بعض اوقات سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔جس سے اس الزام کی تردید ہوئی کہ علما ملک کی عام زندگی ،جدید تحریکوں اور سرگرمیوں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور ان میں جدید رجحانات کے سمجھنے اور ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کی صلاحیت نہیں۔ دارالمصنفین اور اس کا ماہ نامہ معارف (جو عرصہ دراز تک مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں نکلا) عالم اسلام میں خاصی شہرت اور عزت رکھتے ہیں۔''[۲۷]

دارالحدیث رحمانیہ دہلی

مذکورہ مدرسے قائم تو ہوئے قرآن وسنت کی احیاء اور اس کی نشر واشاعت کے لیے ،لیکن متعارف ہوتے تھے حنفی مسلک کی ترجمانی کے لیے ۔تاہم ان مدرسوں میں دوسری فکر کے طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ضرورت تھی کہ کوئی ایسا مرکزی مدرسہ قائم ہو جو بطور خاص مسلک اہل حدیث کے لیے ہو۔ چنانچہ امیر المجاہدین صوفی عبدالرحمٰن وزیر آبادی (م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) کی مساعی سے دہلی میں دارالحدیث رحمانیہ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء کو باڑہ ہندوراؤ دہلی میں قائم ہوا۔ علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی (م ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء) کی ایما پر مشہور تاجر شیخ عبدالرحمٰن (م ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) اور ان کے بھائی شیخ عطاء الرحمٰن (م ۱۳۵۷ھ/

۱۹۳۸ء) نے اپنے خرچ سے اس کی تعمیر و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ چوں کہ دونوں بھائی جماعت مجاہدین کے سالاروں میں سے تھے، اس لیے اس نیک کام کو انجام دینے میں انہوں نے کوئی تامل نہ کیا۔ انہی دنوں مولانا ابراہیم میر سیال کوٹی (م ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء) دہلی میں ایک مدرسہ چلا رہے تھے۔ جب ان کو اس مدرسہ کے قیام کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے مدرسہ کو اس کے تمام ساز وسامان اور لائبریری کے ساتھ اس مدرسہ میں ضم کر دیا۔ چوں کہ دونوں بھائی کے ساتھ رحمٰن کا لفظ لگا ہوا تھا، اس لیے انہیں دونوں بھائیوں کے نام سے اس مدرسہ کا نام 'رحمانیہ' رکھا گیا۔

اس مدرسہ میں ادنی سے آٹھویں جماعت تک منقولات ومعقولات کی بڑی ٹھوس تعلیم ہوتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کو ایسی شہرت ملی کہ نہ صرف ہندوستان کے ہر خطہ سے، بلکہ بیرون ملک نجد وحجاز وغیرہ سے بھی طلبا یہاں پڑھنے آنے لگے۔ اس مدرسہ نے کتاب وسنت اور علم دین کی اشاعت کے لیے ملک میں بڑے اچھے اور لائق علماء پیدا کیے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے حادثے کی وجہ سے یہ مدرسہ بند ہو گیا تو اس کی لائبریری اور عمارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے حصے میں آئی۔ اس مدرسہ کے بعض فارغین کی مساعی سے بعد کے ادوار میں مختلف مقامات پر سلفی ادارے قائم ہوئے۔

مولانا ابراہیم سیال کوٹی، شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی (م ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء)، مولانا غلام یحیی پنجابی کان پوری، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ ندوی، مولانا عبدالغفور جے راج پوری، مولانا عبدالحکیم ٹونکی (م ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء)، مولانا سکندر علی ہزاروی، مولانا محمد اسحاق، مولانا محمد احمد (م ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۸ء)، بن ملا حشام الدین (م ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء) مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء)، مولانا عبدالصمد مبارک پوری، مولانا نذیر احمد املوی (م ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا عبدہ الفلاح (۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)، مولانا بشیر مبارک پوری، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری (م ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء) وغیرہ نے یہاں درس وتدریس کے فرائض انجام دے کر علوم اسلامیہ کے فروغ واشاعت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ۳۷

خاتمہ:

الحمد للہ موجودہ دور میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں دینی تعلیم کے ادارے موجود ہیں۔ یہ ادارے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ہر سطح کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت تسلسل ہے اس چیز کا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں دینی تعلیم سے دل چسپی لی ہے اور دینی مدارس کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس معاملے میں دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ گزشتہ سطور میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ اس کا پختہ ثبوت ہیں۔

حواشی ومراجع

۱ شاہ معین الدین احمد ندوی، مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء، ج:۲، ص:۱

۲ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ج:۱، ص:۱۰-۱۱

۳ ضیاء الحسن فاروقی، مسلمانوں کا نظام تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص:۴۵
عبدالرزاق کان پوری، نظام الملک طوسی، نامی پریس، کان پور، ۱۹۱۲ء، ص:۶۴۱
علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ج:۳، ص:۳۸

۴ قاسم فرشتہ ہندوشاہ، تاریخ فرشتہ، مکتبہ ملت، دیوبند، ۱۹۸۳ء، ج:۱، ص:۱۲۳ ۵ ایضا، ص:۱۳۲

۶ شمس تبریز، عربی ادب میں اسلام کا حصہ، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۹ء، ص:۶۷

۷ تاریخ فرشتہ، ج:۱، ص:۱۷۲

۸ عبدالحی الحسنی، نزہۃ الخواطر فی بھجۃ المسامع والنواظر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء، ج:۱، ص:۵۷

۹ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء، ج:۲۰، ص:۱۸۰ ۱۰ ایضا

۱۱ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص:۹۵

۱۲ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادبی دنیا ٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۵

۱۳ ایس۔ایم۔جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص:۳۴

۱۴ ریاست علی ندوی، اسلامی نظام تعلیم، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص:۴۶

۱۵ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج:۲۰، ص:۱۸۰

۱۶ امداد صابری، دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، صابر اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص:۶۱
عبدالحی الحسنی، الہند فی العہد الاسلامی، مطبوعہ دارالعرفات، رائے بریلی، ۲۰۰۱ء، ص:۳۵۹

۱۷ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء، ص:۱۸
۱۸ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۱۰۱
۱۹ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۶۱۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم مملوکیہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص:۱۷۴-۱۷۵
۲۰ ایضاً، ص:۳۵ ۲۱ ایضاً، ص:۳۷
۲۲ تاریخ فرشتہ، ج:۱، ص:۳۹۳ ۲۳ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۳۸
۲۴ تاریخ فرشتہ، ص:۳۹۲ ۲۵ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۱۸
۲۶ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۳۵۳-۳۵۴
۲۷ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۴۲
۲۸ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲۰، ص:۱۸۲
۲۹ ایضاً، ص:۴۲۔الہند فی العہد الاسلامی، ص:۳۵۹
۳۰ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۱۹-۲۰
۳۱ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۴۲
۳۲ ایضاً، ص:۴۳۔الہند فی العہد الاسلامی، ص:۳۵۹۔مولوی ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان، مطبوعہ علی گڑھ، ج:۲، ص:۲۰۸،
۳۳ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۳۴
۳۴ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲۰، ص:۱۸۲
۳۵ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۸۶-۸۷
۳۶ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۲۲
۳۷ عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ص:۴۶
۳۸ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۹۵
۳۹ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۹۸
۴۰ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبارالاخیار، فرید بک ڈپو، دہلی، ص:۴۹۲
۴۱ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۹۹
۴۲ مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ (مرتب: مالک رام) ساہتیہ اکادیمی، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص:۲۶۳-۲۶۴
۴۳ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۲۱۸-۲۱۹
۴۴ ہاشم علی خافی خاں، منتخب اللباب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۳ء، ج:۱، ص:۲۴۹
۴۵ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۹۹
۴۶ ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، تاریخ شاہ جہاں (مترجم اردو: ڈاکٹر سید اعجاز حسین) قومی

کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۰۶

۴۷ دیکھئے راقم کا مضمون: 'شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی: اصلاحی وتجدیدی خدمات کی روشنی میں'، مجلّہ دراسات دینیہ، ۲۰۰۵ء، فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص: ۱۵۲

۴۸ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، مطبوعہ دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء، ج: ۱، ص: ۷۷

۴۹ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۲۳

۵۰ تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص: ۷۷، ج: ۱۔ الہند فی العہد الاسلامی، ص: ۳۶۰

۵۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج: ۲۰، ص: ۱۸۵

۵۲ تاریخ شاہ جہاں، ص: ۳۰۶ ۵۳ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص: ۲۲۳

۵۴ کاظم شیرازی، عالم گیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۶۸ء، ج: ۲، ص: ۸۶-۸۵

۵۵ محمد علی خاں، مراۃ احمدی، نامی گرامی فتح الکریم، ممبئی، ۱۳۰۷ھ، ج: ۱، ص: ۲۷۲

۵۶ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج: ۲۰، ص: ۱۸۵

۵۷ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۳۸ ۵۸ تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج: ۱، ص: ۷۹

۵۹ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص: ۱۱۳-۱۲۰

۶۰ ایضاً، ص: ۱۲۳۔ دارالعلوم دیوبند، ص: ۸۰ ۶۱ ایضا

۶۲ ایضا، ج: ۱، ص: ۱۴۱ ۶۳ ماہنامہ الرشید لاہور، ''دارالعلوم دیوبند نمبر'' ص: ۴۷۰-۴۸۰

۶۴ تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج: ۱، ص: ۴۶۵

۶۵ مولانا عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، مکتبہ الشیخ، سہارن پور، ج: ۱، ص: ۲۴۶

۶۶ شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی، تاریخ مظاہر، کتب خانہ اشاعت العلوم، سہارن پور، ۱۳۹۲ھ، ج: ۱، ص: ۵-۶

۶۷ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ص: ۳۷-۳۸

۶۸ محمد ثانی حسنی ندوی، حیات خلیل، مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنو، ح: ۱، ص: ۱۶۶-۱۶۷

۶۹ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص: ۲۹۸-۲۱۴

۷۰ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ص: ۳۰

۷۱ سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص: ۹۳

۷۲ ایضاً، ص: ۹۴-۹۵

۷۳ مجلّہ اہل حدیث، یادگار مجلّہ بموقع اٹھائیسواں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس، پاکوڑ، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۹۹-۳۰۲، مرکزی جمعیت اہل حدیث، دہلی

☆☆☆

بحث ونظر

صحابیات اور علم کی تحصیل واشاعت

ڈاکٹر زاہدہ شبنم

کہا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر دیا ہے اور اسے باہر نکل کر علم حاصل کرنے اور اپنے علم سے دوسروں کو فیض پہنچانے کی اجازت نہیں ہے، اس بنا پر سماج کو اس کی علمی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل پاتا۔ یہ اسلام پر بڑا بے جا الزام ہے۔ مولانا سید جلال الدین عمری کی مشہور تصنیف 'عورت اسلامی معاشرہ میں' اس الزام کا پرزور رد کرتی ہے۔ اس میں مصنف نے قرآن وسنت کے محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام نے عورت کی تعلیم وتربیت سے گہری دل چسپی لی ہے اور سماج کو اس سے فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے صحابیات وتابعیات کی علمی خدمات اور سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ زیر نظر مضمون سے بھی اس موضوع پر مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ (معاون مدیر)

اسلام نے علم کی جو تحریک برپا کی، اس میں مرد اور عورت، آزاد اور غلام، بڑے اور بچے سب شامل ہوئے اور علمی ذوق اور علمی سرگرمیوں کو ایسا ارتقاء بخشا کہ چشم فلک نے ان سے بڑھ کر علم کے متلاشی نہ دیکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم پرور پیغمبر تھے، آپؐ نے اپنی علم دوستی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں منتقل کیا اور ان کے لیے علمی ارتقاء کے مواقع فراہم کیے۔ علم اور حصولِ علم کی فضیلت بتائی اور اس پر اتنا زور دیا کہ اس وقت کی مسلم امت نے حصولِ علم اور علمی ارتقاء کو ایک دلچسپ مشغلہ بنا لیا۔ آپؐ نے اہلِ علم کی قدر افزائی فرمائی، جس سے علم کی محبت اور اس کے حصول کی خواہش میں اضافہ ہوا۔ عہد رسالت میں مردوں کی طرح خواتین نے بھی حصول علم کے لئے خوب

محنتیں کیں اور اس کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ آئندہ سطور میں صحابیات رضی اللہ عنہن کی تحصیل علم اور اشاعتِ علم کی جدوجہد کا جائزہ لینا مقصود ہے، ان شاءاللہ۔

حبِّ علم اور ذوقِ علم

عرب کے معاشرے میں جہاں جنگجوئی ہی سب سے بڑی خوبی شمار کی جاتی تھی، آپؐ نے علم کو تمام اوصاف میں سرفہرست رکھا اور اسے مسلمانوں کی گمشدہ میراث قرار دیا۔ چنانچہ صحابہ کرام کے ساتھ صحابیات بھی ہمیشہ علم کی متلاشی اور اسلامی معاشرہ میں علم وعمل کی شمع روشن رکھنے کی متمنی رہتی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد کی خواتین کو حصولِ علم کے فضائل وترغیبات کے ذریعے بہت زیادہ حسّاس بنا دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس حق کے حصول کے لئے خود بھی کوشش کی، اور بارگاہِ رسالت مآب میں ان کے اس حق کو تسلیم بھی کیا گیا۔ صحابیات کے علمی ذوق کا اندازہ درج ذیل دو واقعات سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ صحابیات اپنی علمی پیاس کا شدید احساس رکھتی تھیں اور منبع علم وہدایت سے دوری کو شدت سے محسوس کرتی تھیں۔ حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے (جو مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں) گفتگو کرتے ہوئے ہجرتِ مدینہ میں اپنی سبقت پر فخر جتایا تو انھوں نے جواب دیا:

> ''ہرگز نہیں، تمہارے ساتھ رسول اللہ ﷺ تھے، جو تمہارے بھوکوں کو کھلاتے اور جاہلوں کو وعظ ونصیحت کرتے تھے، جب کہ ہم دور دراز کی سرزمین پر دھکے کھا رہے تھے اور یہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں تھا۔''[۱]

صحابیات مردوں سے الگ اور اجتماعی طور پر حصول علم کا جذبہ رکھتی تھیں اسی لیے انہوں نے معلم اعظم ﷺ سے اس کی درخواست کی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں:

> ''ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: اے اللہ کے

رسول ﷺ! آپؐ کی سب حدیثیں مردوں نے ہی لے لیں۔ آپ ایک دن ہمارے لیے خاص کر دیں اور ہمیں بھی وہ باتیں سکھلائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سکھائی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا فلاں فلاں جگہ اکھٹی ہو جایا کرو۔ چنانچہ وہ اکھٹی ہوئیں اور آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور جو باتیں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھلائی تھیں وہ ان کو سکھلائیں''۔[۲]

تحصیل علم کے طریقے

صحابیات نے اپنے اس ذوقِ علمی کو جلا بخشنے اور اسے بڑھانے کے لیے وہ تمام طریقے اختیار کیے جو ضروری ہوتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ ''حضرت ام سلمہؓ ایک لڑکی سے کنگھی کروا رہی تھیں کہ انھوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں منبر سے خطبہ دے رہے ہیں، آپؐ نے 'ایھا الناس' (لوگو) کہہ کر خطاب کا آغاز کیا حضرت ام سلمہ نے لڑکی سے کہا میرے بال جلدی سے سمیٹ دو، اس نے عرض کیا ابھی تو آپؐ نے ایھا الناس ہی ارشاد فرمایا ہے۔ کہنے لگیں: ''کیا ہم انسانوں میں سے نہیں ہیں، انھوں نے حجرے میں خطبہ کھڑے ہو کر سنا۔''[۳]

صحابیات تحصیل علم کے لئے معلم کے پاس حاضر ہوتی تھیں۔ انھیں کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تو شرم و حیا مانع نہ ہوتی تھی۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: میں نے اپنی بچی کا نکاح کیا۔ وہ بیمار ہوگئی، جس سے اس کے بال جھڑ گئے اب اس کا خاوند مجھے تنگ کر رہا ہے۔ کیا میں اس کے سر پر مصنوعی بال لگا دوں؟ آپؐ نے یہ سن کر مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی دونوں پر لعنت کی۔[۴]

صحابیات اپنا فارغ وقت مسجد میں یا اہلِ علم کی صحبت میں گزارنا پسند کرتی تھیں۔ حضرت الربیع بنت معوذؓ روایت کرتی ہیں کہ (جس زمانے میں عاشوراء کا روزہ فرض تھا) ہم عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے، اور مسجد چلے

جایا کرتے تھے۔ ہم اون کا کھلونا بنا لیتے تھے جو بچے کے رونے پر اُسے تھما دیا جاتا اور وہ افطار تک اسی سے دل بہلاتا تھا۔''۵

اسی طرح حضرت عائشہؓ ایک عورت کا قصہ بیان کرتی ہیں کہ وہ بے سہارا لونڈی تھی، اس کے لیے مسجد نبوی میں خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتی میرے پاس آجایا کرتی تھیں اور میرے ساتھ بات چیت کرتی تھی''۔۶

صحابیات خالص مذہبی علوم کے علاوہ اپنی دلچسپی اور اہلیت کے مطابق دیگر علوم کا بھی انتخاب کرتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کی اہلیت اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ان علوم کے انتخاب کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

حضرت عمرؓ اچھے کاتب تھے۔ کتابت کا شوق ان کی صاحب زادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کو بھی تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی دلچسپی اور اہلیت کی بنیاد پر ان کے لیے کتابت کی معلّمہ کا تقرر فرمایا تھا۔۷

حضرت سودہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ طبعاً فیاض تھیں اور بالترتیب طائف کی کھالیں (ادھوڑی) اور دباغت ۸ میں مہارت رکھتی تھیں۔ آپؐ نے ان کے اس مشغلہ کی کبھی نکیر نہ فرمائی، نہ ان کے معمولات کو اس طور پر مرتب کیا کہ ان کے لیے اپنی مہارت کے استعمال کا وقت ہی نہ بچ سکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینب بنت ابی معاویہ بھی اسی طرح کا ایک ہنر جانتی تھیں، آپؐ نے انھیں اس کے ذریعے حاصل کردہ آمدنی کو اپنے شوہر اور بچوں پر خرچ کرنے کو دوہرا صدقہ بتایا۔۹

صحابیات میں سے سب سے بڑی عالمہ حضرت عائشہؓ تھیں اور ان کے بعد حضرت ام سلمہؓ۔ آں حضرت ﷺ مختلف مواقع پر ان سے ایسی گفتگو فرماتے تھے، جس سے ان کی ذہانت کو بڑھنے کا موقع ملے اور یہ دونوں بھی آپؐ سے ہر قسم کے سوال کرتی تھیں اور آپؐ خوشی کے ساتھ ان کے جوابات ارشاد فرماتے تھے۔

صحابیات علمی اجتماعات میں شریک ہوتی ہیں، جس کی بنا پر ان کے علمی ذوق و شوق میں اضافہ ہوتا تھا اور ان کے دلوں میں اشاعت علم کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔

حضرت خولہ بنت قیسؓ جمعہ کی نماز میں شرکت کرتی تھیں اور آں حضرت ﷺ کا خطبہ سنا کرتی تھیں۔ اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر خواتین کثیر تعداد میں موجود رہا کرتی تھیں، فرماتی ہیں:

کنت اسمع خطبة رسول الله صلی الله علیه و آلہٖ وسلم یوم الجمعة وأنا فی مؤخر النساء۔[۱۰]	جمعہ کے روز میں رسول اللہ ﷺ کا خطبہ اچھی طرح سنا کرتی تھی حالاں کہ میں خواتین میں سب سے آخر میں ہوتی تھی۔

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نے ایک روایت میں اس ہنگامی اجتماع میں شرکت کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے جو جساسہ کے بارے میں معلومات دینے اور حضرت تمیم داری کے احوالِ سفر سنانے کے لئے بلایا گیا تھا۔[۱۱]

حضرت عمرۃ بنت عبدالرحمٰن اپنی بہن کے حوالے سے بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے کہا: ''میں نے جمعہ کے روز رسول اللہ ﷺ کے منہ سے سن کر سورۂ قٓ زبانی یاد کی ہے۔ اس سورہ کو آپ ہر جمعہ منبر پر پڑھا کرتے تھے''۔[۱۲]

حضرت کریمہ بنت الحسحاس المزنیہؒ اس قسم کی ایک مجلس کا تذکرہ اس طرح کرتی ہیں:

''ہم حضرت ام الدرداء کے گھر میں تھے، وہاں ہم سے حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **انا مع عبدی ماذکرنی وتحرکت بی شفتاہ**۔ (میں اپنے بندے کیساتھ ہوں جب تک وہ میرا ذکر کرے اور اس پر اس کے ہونٹ ہلیں)۔ یہ روایت امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کی ہے۔[۱۳] روایت کے الفاظ **نحن فی بیت ام الدرداء** سے سماع حدیث کے لیے صحابیات کی مجلس ثابت ہوتی ہے۔

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابیات ایک دوسرے سے سماعِ علم کرتی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور اس پر حضرت

عائشہؓ کی روایت سے استدلال کرتے۔ مروان نے حدیث کی تصدیق کے لئے حضرت عائشہؓ کے پاس آدمی بھیجا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حدیث میں نے ام سلمہؓ سے سنی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: ''اللہ عائشہؓ کی مغفرت فرمائے۔ انہوں نے بات سمجھی نہیں۔ کیا میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا؟ کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے''۔[۱۴]

صحابیات کی سماعِ حدیث کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے روایت کی ہے مثلاً:

- ام المومنین حفصۃ عن الشفاء بنت عبداللہ
- ام المومنین حضرت عائشہ الصدیقۃ عن جذامۃ بنت وہب
- ام مبشر الانصاریہ عن حفصۃ ام المومنین
- ام کلثوم بنتِ عقبۃ عن بسرۃ بنت صفوان

تحصیل علم کے یہ مختلف طریقے اختیار کر کے صحابیات نے اپنی علمی پیاس بجھائی، علمی ارتقاء حاصل کیا، اشاعتِ علم کے جذبے کو مہمیز دی اور آئندہ نسلوں کے لیے علمی رویوں کو متعارف کروایا۔ درحقیقت عہدِ رسالت کے بعد کی تاریخ اسلام میں علمی عروج کی ساری داستانیں انہی رویوں کی رہین منت ہیں۔

علمی رویوں کی پہچان

علمی رویوں کی پہچان افزائش علم اور اشاعت علم کے اسباب سے ہوسکتی ہے۔

علمی ارتقاء کے لیے اختلافِ رائے کو برداشت کرنا، علمی مواقع کا متنوع اور کثیر ہونا، اکابر کا اصاغر کی حوصلہ افزائی کرنا، تلامذہ کی ہر طرح سے راہنمائی کرنا اور ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تحلیلی اہلیتوں کو تسلیم کر کے ان کو مزید نکھارنے کی مخلصانہ کوششیں کرنا، اہل خانہ کو علمی راہنمائی مہیا کرنا، اہل علم کی قدر و منزلت اہل ثروت و حکومت سے بڑھ کر کرنا اور اسلاف کی محنتوں، لیاقتوں کا اعتراف کرنا، بنیادی اصولوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ

اجتہاد کے دروازے کو کھلا رکھنا ضروری ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں علم کی قدر و منزلت اپنے مابعد تمام ادوار سے بڑھ کر تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عربوں کے مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں حضرت شفاءؓ کی حساب دانی میں قابلیت و امتیاز کی بنا پر انہیں بازار کے معاملات کا نگران مقرر کر دیا۔ ۱۵ اس عہد میں باہم اختلاف رائے کو دشمنی اور تعصب میں نہیں ڈھالا گیا۔ حضرت عائشہؓ کا متعدد صحابۂ کرام سے (مسائل میں) اختلاف رائے ہوا، لیکن محدثہ و فقیہہ کے طور پر ان کا احترام تمام صحابہ کرتے تھے۔ غلطی کو تسلیم کرنے کا بھی عام رواج تھا۔ علمی مواقع کثیر تھے، پانچ وقت تو نماز کی حاضری میں اجتماع ہوتا، علمی مجالس اس کے علاوہ تھیں، اکابر ہمیشہ اصاغر کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ۱۶ دلچسپی اور اہلیت کی بنیاد پر اصاغر اور تلامذہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إرجعوا إلى اهليكم فاقيمو افيهم وعلّموهم ۱۷	اپنے اہل وعیال میں لوٹ جاؤ، انہی میں رہو اور انہیں تعلیم دو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل خانہ کی تعلیم اسلام کی علمی تحریک کے مقاصد میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

اس تفصیل سے درج ذیل رویئے متعارف ہوئے، جو علمی ارتقاء میں مددگار ہوسکتے ہیں۔

۱- علم دوستی جو تمام مفادات پر غالب ہو۔
۲- اقتصادی خوشحالی کی ثانوی حیثیت۔
۳- تحصیل علم کی شدید خواہش۔
۴- اختلافِ رائے کو برداشت کرنا۔
۵- اعلیٰ ظرفی سے علمی مواقع اور سہولیات مہیا کرنا۔
۶- اکابر کا اصاغر اور تلامذہ کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کے لیے تحصیل علم کے

راستوں کو آسان کرنا۔

۷- تلامذہ کی تخلیقی، تحقیقی اور تجزیاتی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا۔

۸- اساتذہ کا بے لوث ہونا۔

۹- علم اور اہل علم کی اہل ثروت سے بڑھ کر قدر کرنا۔

۱۰- اہل خانہ کو تعلیم سے آراستہ کرنا۔

یہ وہ علمی رویئے ہیں جو علمی مشاغل کو زندہ رکھتے اور علمی ارتقاء کو عروج بخشتے ہیں۔

صحابیات کا سب سے بڑا علمی کارنامہ اور احسان یہ ہے کہ انہوں نے اشاعت علم کے لیے ان علمی رویوں کو پروان چڑھایا، جو آئندہ کے سینکڑوں سالوں کی علمی ترقی کی بنیاد بنے۔ ایک کام انھوں نے یہ کیا کہ دیگر خواتین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ یہ کام انھوں نے دو طرح سے کیا۔ ایک جز وقتی: یعنی ملاقات وغیرہ پر، جیسے حضرت میمونہؓ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے ذکر کیا کہ اس نے نذر مانی تھی کہ اگر اُسے اللہ نے شفا دی تو وہ مسجد اقصیٰ جا کر نفل ادا کرے گی، اس پر حضرت میمونہؓ نے اسے تعلیم دی کہ نذر کو ادنیٰ سے افضل میں بدلا جاسکتا ہے اور اس سے کہا: ''مسجد نبوی میں نماز پڑھو''۔[۱۸]

حضرت عائشہؓ کے پاس حمص کی کچھ عورتیں آئیں تو انھوں نے دریافت کیا: کیا تم ایسے علاقے کی رہنے والی ہو جہاں کی عورتیں حماموں میں جا کر غسل کرتی ہیں؟

خواتین نے جواب دیا: ہاں، تب حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو عورت اپنے کپڑے غیر پوشیدہ جگہ میں اتارتی ہے، وہ اللہ کی سخت ناراضی کی مستحق ہوتی ہے۔''[۱۹]

اسی طرح انھوں نے کل وقتی تعلیم بھی دی۔ اسے مکمل تعلیم و تربیت بھی کہہ سکتے ہیں، صحابیات نے قابلیت، اہلیت اور دلچسپی کی بنیاد پر بعض خواتین کو تعلیم و تربیت کے لئے منتخب کیا اور انہیں حدیث نبوی کا ذخیرہ منتقل کیا اور فقہ و بصیرت کی تربیت بھی دی۔

حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن الانصاریہؒ مدینہ منورہ کی مشہور ترین عالمہ تابعہ ہیں۔

ان کی تربیت حضرت عائشہؓ نے خصوصی طور پر فرمائی، حضرت عائشہؓ کی احادیث اور فقہی آراء کا سب سے زیادہ علم انہی کے پاس تھا۔۲۰ محمد بن عبدالرحمٰن کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عمرہ کے پاس محفوظ اس علمی امانت کے بارے میں لکھا تھا۔

مابقی أحد أعلم بحدیث عائشة من عمرة ۲۱ اب کوئی ایسا نہیں رہ گیا جس کے پاس حدیث عائشہ کا علم عمرۃ سے زیادہ ہو۔

صحابیات نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ خاندان کے مردوں اور عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے علم کو امانت سمجھ کر اگلی نسل کو منتقل کیا، یہ ایک ایسا زبردست انقلاب تھا جس کی وجہ سے کئی صدیوں تک اسلامی تاریخ کو علم کی تاریخ کے طور پر مرتب کیا جاتا رہا۔ صحابیات کے رشتہ دار تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت کرنے والے مرد رشتہ داروں میں ان کے صاحبزادے عمر بن ابی سلمہ، بھائی عامر بن ابی امیہ، بھتیجے مصعب بن عبداللہ بن ابی امیہ اور خواتین میں صاحب زادی حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ مشہور ہوئیں۔۲۲

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت کرنے والے رشتہ دار مرد تلامذہ میں صاحب زادگان عبداللہ بن الزبیر اور عروہ بن الزبیر، پوتے عبداللہ بن عروہ بن الزبیر اور عباد بن عبداللہ بن الزبیر اور رشتہ دار خواتین میں پوتی فاطمہ بنت المنذر کے نام کتب اسماء الرجال میں ملتے ہیں۔۲۳

اسی طرح صحابیات نے آزاد کردہ غلاموں (موالی) اور آزاد کردہ باندیوں (موالات) کو بھی علم منتقل کیا۔ حضرت ام سلمہؓ کی مولاۃ 'خیرہ' بہت ذہین تھیں، علم حدیث میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں، چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے اُن کی بہترین تربیت کی اور انہیں علم حدیث منتقل کیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ امت مسلمہ کو تابعین کے دور میں عظیم فقیہہ میسر ہوسکا، یعنی انہوں نے اپنے صاحب زادے حسن بصری کی تربیت کی اور انھیں حضرت ام سلمہؓ کا علم منتقل کیا، اسی طرح دوسرے صاحب زادے حضرت سعید بصری بھی اپنی والدہ

'خیرہ' کے تلامذہ میں سے ہیں۔۲۴

حضرت میمونہؓ کے مولیٰ حضرت یسار تھے، حضرت میمونہؓ نے اپنا سارا علم انہیں منتقل کیا اور فقہ و بصیرت کی تربیت بھی دی، چنانچہ وہ تابعین کے دور کے لئے نہایت مبارک ثابت ہوئے، اُن کے چار صاحب زادے تھے۔ عطاء بن یسار، سلیمان بن یسار، مسلم بن یسار اور عبدالملک بن یسار، یہ چاروں بھائی فقہائے اسلام میں سے ہیں۔۲۵

صحابیات نے ان کے علاوہ عام مردوں کو بھی علم سے نوازا۔ مثلاً: بصری فقہاء و علماء نے غسل میت کا طریقہ عظیم محدثہ صحابیہ حضرت ام عطیہ الانصاریہؓ سے سیکھا۔۲۶

اپنے وقت کے ائمہ سعید بن مسیّب، عامر الشعبی، عروہ بن الزبیر، قاسم بن محمد وغیرہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے علم حدیث لیتے تھے۔۲۷

حفظ علم اور صحابیات

صحابیات جس دور سے تعلق رکھتی تھیں اس میں حفظ علم کے دو ذرائع تھے۔ ایک ضبط صدر یعنی حافظہ اور دوسرا ضبط کتاب یعنی تحریر۔ ان ذرائع میں سے پہلے ذریعے کو اس دور کا مقبول عام ذریعہ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ضبط کتاب یعنی تحریر و تالیف کا عام رواج نہ تھا، اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں اس کی چند مثالیں ملتی ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا حافظہ ضرب المثل تھا، اور تحریری مسودوں کا سہارا لینا اہل علم عیب خیال کرتے تھے۔ صرف کوئی معاہدہ یا دیگر وہ چیزیں جنہیں وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے وہی لکھی جاتی تھیں، اسلام نے جو علمی تحریک برپا کی اس میں کتابت اور تحریر کو بھی اہمیت دی گئی، چنانچہ صحابۂ کرام قرآنِ مجید کی کتابت کے ساتھ حدیثِ رسول کو بھی ضبط تحریر میں لائے۔ صحیفہ صادقہ وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ لیکن صحابہ کرام کی طرح صحابیات میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ خواتین کی علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے اسے 'حدیث کی تدوین وجمع آوری کا صدری دور' کہنا زیادہ مناسب ہے اگرچہ بعد میں خواتین میں بھی اس کا آہستہ آہستہ رواج ہو گیا، تا آنکہ خواتین محدثات نے اپنے مشیخات (کتب

حدیث) تالیف کیے، جن کی باقاعدہ تدریس وسماع ہوتا رہا، لیکن یہ صحابیات کے بعد کے ادوار میں ہوا۔ حدیث کی تدوین وجمع آوری کے صدری دور میں صحابیات میں حفظِ حدیث کی صرف سماعی صورت رواج پذیر تھی اور اس کے دو مصادر تھے۔ اول رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست سماع کرنا: اس کے لیے صحابیات فجر وعشاء کی نمازوں میں مساجد جاتیں، اجتماعات میں شرکت کرتیں، خطباتِ جمعہ وعیدین کے لیے گھروں سے نکلتیں، اسفار میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوتیں، آپؐ کے گھر استفتاء اور حصول علم کے لیے حاضر ہوتیں اور مردوں سے الگ صرف خواتین کے لیے مخصوص علمی مجلسوں میں ذوق و شوق سے حاضر ہوتیں۔ دوم دیگر صحابہ اصحابیات سے سماع حدیث کرنا: عہدِ رسالت سے معاً متصل خلافتِ راشدہ میں اس کی ایک صورت مسندات کی صورت میں سامنے آئی، صحابیات کی باقاعدہ مسندات کی تعداد صحابہ کی مسندات سے قدرے کم تھی، البتہ اپنے باپوں، بھائیوں، شوہروں اور بیٹوں وغیرہ سے ان کا سماع محدثین نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اُسے اسی طرح اہمیت دی ہے جس طرح صحابہ کے باہم سماع کو دی ہے۔ صحیحین میں ایسی متعدد روایات موجود ہیں، جن میں ایک خاتون نے دوسری خاتون سے سماعت کی ہے۔ مثلاً: عمرہ بنت عبدالرحمٰن عن عائشہ، ہند بنت الحارث عن ام سلمہ، زینب بنت ام سلمہ عن زینب بنت جحش۔

صحابیات کی کثیر تعداد ایسی بھی ہے جس نے اپنے محرم مرد رشتہ داروں سے سماع حدیث کیا، پھر اسے آگے منتقل کیا۔ مثلاً

ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا عن عمر رضی اللہ عنہما، ام المؤمنین عائشہ عن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما۔

البتہ خلافتِ راشدہ کے اوائل میں صحابیات نے تحریر کی طرف توجہ دی۔ حضرت عائشہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ لوگ دور دراز سے ان کو یا ان کی تلامذہ کو خطوط لکھتے، تو وہ ان کا جواب لکھواتیں، مسند احمد میں حضرت عائشہ بنت طلحہؒ (جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھانجی اور خاص شاگرد ہیں) سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں:

كان الناس يأتونها من كل مصر، فكان الشيوخ ينتابونى لمكانى منها وكان الشباب يتأخونى فيهدون إلى ويكتبون إلى من الامصار فاقول لعائشة ياخالة، هذا كتاب فلان و هديته فتقول لى، عائشة، أى بنية فاجيبيه واثيبيه۔۲۸

تمام شہروں سے لوگ حضرت عائشہؓ کے پاس آتے، بوڑھے اور بزرگ مجھ سے ملتے۔ حضرت عائشہؓ سے میرے تعلقات کی بنا پر، اورنوجوان مجھ سے مواخات کرتے، لوگ میری طرف تحفے بھیجا کرتے اور خط لکھتے تھے، میں حضرت عائشہؓ سے عرض کرتی کہ یہ فلاں شخص کا خط اور تحفہ آیا ہے، فرماتیں، بیٹی! اسے جوابی خط لکھواور بدلہ میں تم بھی کچھ بھیجو۔

ظاہر ہے حضرت عائشہؓ مکتوبات میں محض حال چال نہ دریافت کرتی ہوں گی بلکہ جس طرح وہ ہر ملنے والے کو نصیحت کرتی تھیں، اسی طرح مکتوبات میں بھی نصیحت کرتی ہوں گی اور ہر نصیحت کی اساس حدیث پر رکھتی ہوں گی۔

درس و تدریس اور وعظ

حفظ علم کے بعد انتقالِ علم کا دوسرا اہم ذریعہ درس و تدریس وعظ و ارشاد اور خطابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ خطابت کی خود تربیت دیا کرتے تھے۔ عہد رسالت میں مردوں کے ساتھ خواتین میں بھی دعوت و تبلیغ کا شعبہ سرگرم رہا آپؐ کے خطبات اور وعظ ونصیحت کی مجلسوں میں خواتین اکثر و بیشتر حاضر ہوتیں۔ کبھی آپؐ اپنا نمائندہ خواتین کی تربیت واصلاح کے لیے بھیجتے ۲۹ آپؐ ان کی خطابت ووعظ کی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ،۳۰ ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ میں فصاحت و بلاغت اور خطابت کی صلاحیت وقابلیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ آپؐ نے ایک مرتبہ حضرت زینب بنت جحشؓ کے جواب میں حضرت عائشہؓ کی تقریر نما گفتگو سنی، تو فرمایا: ''آخر ابو بکر کی بیٹی ہے''۔۳۱ ماہرین فن نے حضرت عائشہؓ کے خطبات (جوانھوں نے جنگ جمل وغیرہ کے دنوں میں دیے) پر تحسین کی ہے۔۳۲

اسی طرح حضرت اسماء بنت یزید بن السکنؓ کو کتب سیر میں 'خطيبة النساء'

کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے برسرِ مجمع ان کی خطیبانہ صلاحیت کی تعریف فرمائی تھی۔ حضرت ام الدرداءؓ بھی اچھا وعظ کہہ لیتی تھیں۔[۳۳]

افتاء

صحابیات نے افتاء کی بھی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس سلسلے میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کا نام نامی بہت نمایاں ہے۔ وہ موسم حج میں اپنے خیمہ میں ہوتیں اور استفتاء کے لیے آنے والوں کا ہجوم لگا رہتا۔ کبھی زمزم کی چھت کے نیچے تشریف رکھتیں اور لوگوں کا بڑا ہجوم ان سے درپیش سوالات کا حل پوچھ رہا ہوتا۔ گویا حضرت عائشہؓ ایامِ حج میں اطرافِ عالم سے آنے والے مسلمانوں کو علم منتقل کرنے کے لیے عارضی طور پر اپنی مسند، مکہ میں کوہ ثبیر کے دامن میں قائم کر لیتی تھیں۔[۳۴]

مدینہ منورہ میں جو صحابہ کرام درس و افتاء کی ذمہ داریاں نبھاتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہؓ ان میں سے اکثر سے کم سن تھیں، مگر ان کا فتوی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں ہی تسلیم کیا جاتا تھا۔ نہ صرف عام افراد ان سے رجوع کرتے، بلکہ اکابر صحابہ بھی اشکالاتِ علمیہ انہی سے حل کرواتے۔ حتیٰ کہ عمر فاروقؓ بھی ان سے حدیث کی دریافت کے لیے رجوع کرتے تھے حالانکہ وہ صرف صرف کبار صحابہ کو فتویٰ دینے کی اجازت دیتے تھے۔ مسند احمد میں ہے:

کانت عائشة تفتی فی عهد عمر و عثمان بعده، یرسلان الیها فیسئلانها عن السنن۔[۳۵]

عائشہؓ عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہما) کے دور میں فتویٰ دیا کرتی تھیں اور وہ دونوں (عمرؓ و عثمانؓ) بھی ان سے سنن (حدیث) کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے محض علمی آغوش مہیا کرنے، انتقالِ علم کا بلا واسطہ ذریعہ اختیار کرنے اور علم حدیث کی اشاعت کے لیے یہ حکمتِ عملی اپنا رکھی تھی کہ بچے اور بچیوں کو گود لے لیتی تھیں، یتیم بچوں کی کفالت کرتی تھیں اور اپنی بہنوں، بھانجیوں اور بھتیجیوں کو انہیں اپنے رضاعی بچے بنانے کی ترغیب دیتیں۔ اس اعتبار سے

بعد از بلوغت آپؓ کا ان سے پردہ ساقط رہتا جس کی بنا پر آپؓ ان کی تربیت وتادیب اور تعلیم کی مکمل نگرانی بھی کرتیں اور انہیں علم حدیث بھی منتقل کرتیں۔ آپ نے اپنے حجرہ میں ہی یہ مسند قائم کی تھی، آپ کے رشتہ دار، یہ رضاعی بچے، خواتین اور زیر تربیت طالبات آپ کے سامنے حجرہ میں بیٹھتے، دیگر طالبانِ علم کے لیے مسجد نبوی کے اس حجرے سے متصل گوشے میں مجلس کا انتظام ہوتا، اور خود پردے کی اوٹ میں بیٹھ کر درس دیتیں، اسی مجلس میں لوگوں کے سوالات کے جوابات دیتیں، اپنے تلامذہ کے خاص اور مشکل موضوعات پر بھی گفتگو کرتیں، کبھی از خود کسی مسئلہ کی وضاحت فرماتیں، اس طرح جو بچے عائشہ صدیقہؓ کے محرم رشتہ میں شامل نہ ہوتے اور رضاعت کے رشتے میں بھی نہ آتے وہ پردے کی اوٹ میں تعلیم لیتے تھے[۳۶]۔ حقیقت یہ ہے کہ مسند عائشہؓ کے فارغ التحصیل حدیث وفقہ میں قابل رشک مقام تک پہنچے۔ ان مستقل مسندات کے اعتبار سے مدینہ میں انتقال علم اور اشاعتِ علم کا سولہ فیصد (۱۶٪) سے زائد یعنی چھٹا حصہ صحابیات کا ہے۔

صحابیات کی درس گاہیں

اس دور میں تعلیمی اداروں کے قیام کا رواج نہ تھا، عہد رسالت میں مسجد نبوی میں مردوں کے لیے مستقل درس گاہ 'صفہ' کے نام پر بنائی گئی، لیکن خواتین کے لیے مستقل درس گاہ کا انتظام نہ تھا، خلافتِ راشدہ میں ان کی باقاعدہ اور سب سے بڑی درس گاہ صرف مسند عائشہ صدیقہؓ ہی تھی۔ صحابیات نے ان حالات میں اپنے اپنے گھروں ہی کو ادارہ جاتی شکل دے دی تھی، جہاں نہایت سادہ انداز میں اشاعت علم کا کام ہوتا تھا۔ وہ اس طرح کہ صحابیات نے اپنے اپنے رشتہ داروں کو تعلیم دینی شروع کی، جن میں مرد بھی تھے اور خواتین بھی۔ محدثاتِ صحابیات کے رواۃ وتلامذہ میں سے بے شمار ان کے اپنے محارم ہیں، مدینہ میں بیسیوں ایسے گھر تھے جو بے نام علمی اداروں کا روپ دھار چکے تھے۔ ذیل میں ان میں سے صرف دس گھرانوں کی فہرست دی جا رہی ہے۔ رشتہ داروں میں موالی بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ بیتِ عائشہؓ

حضرت عائشہؓ عام افادہ کے ساتھ گھر میں بھی ہمہ وقت تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتی تھیں۔ آپ کے رشتہ دار تلامذہ درج ذیل ہیں:

۱۔ قاسم بن محمد (بھتیجا) ۲۔ عبداللہ بن عمر بن عبدالرحمٰن (بھتیجا)
۳۔ ام کلثوم بنت ابی بکر (بہن) ۴۔ عبداللہ بن الزبیر (بھانجا)
۵۔ قاسم بن الزبیر (بھانجے) ۶۔ عباد بن حبیب بن عبداللہ (بھانجے کا پوتا)
۷۔ عباد بن حمزہ بن عبداللہ (بھانجے کا پوتا) ۸۔ عروہ بن الزبیر (پوتا)
۹۔ حبیب بن عبداللہ (بھانے کا بیٹا) ۱۰۔ عوف بن الحارث (رضاعی بھائی)
۱۱۔ حفصہ بنت عبدالرحمٰن (بھتیجی) ۱۲۔ اسماء بنت عبدالرحمٰن (بھتیجی)
۱۳۔ عائشہ بنت طلحہ (بھانجی)
۱۴۔ عبداللہ بن ابی عتیق بن محمد بن عبدالرحمٰن (بھائی کا پوتا)
۱۵۔ یحییٰ بن عباد بن حمزہ بن عبداللہ (بھانجے کے پوتے کا بیٹا)
۱۶۔ ابوعمرو ذکوان (مولیٰ)

۲۔ بیتِ ام سلمہؓ

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بعد حضرت ام سلمہؓ کا گھر طالبانِ علم کا مرجع تھا۔ وہ صحابیات میں عائشہ صدیقہؓ کے بعد سب سے زیادہ روایت کرنے والی ہیں۔ ان کے رشتہ دار تلامذہ مع موالی کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ زینب بنت ابی سلمہؓ (بیٹی) ۲۔ عمر بن ابی سلمہ (بیٹا)
۳۔ عامر بن ابی امیہ (بھائی) ۴۔ عبداللہ بن زمعہؓ (داماد)
۵۔ ابوعبیدہ بن عبداللہ بن زمعہ (نواسہ)
۵۔ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق (بھانجا)
۷۔ مصعب بن عبداللہ بن ابی امیہ (بھتیجا)

۸۔ نبھان (مکاتب) ۹۔ ابن کثیر (مولیٰ)
۱۰۔ سفینہ (مولیٰ) ۱۱۔ عبداللہ بن رافع (مولیٰ)
۱۲۔ ابن سفینہ (مولیٰ) ۱۳۔ ناعم (مولیٰ)
۱۴۔ سلیمان بن یسار (مولیٰ) ۱۵۔ عطاء بن یسار (مولیٰ)
۱۶۔ خیرۃ ام الحسن البصری (مولاۃ) ۱۷۔ نافع (مولیٰ)

۳۔ بیت میمونہؓ

ام المومنین حضرت میمونہ بنت الحارث الھلالیہؓ کا گھر بھی ایک بے شکل مکتب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اگرچہ آپ کو اشاعت علم کا زیادہ موقع نہ مل سکا اور عمر خلافت فاروقی کی ابتداء میں ہی آپ وفات پا گئیں، پھر بھی آپ سے استفادہ کرنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ آپ کے محارم اور موالی تلامذہ درج ذیل ہیں:

۱۔ عبداللہ بن عباسؓ (بھانجا) ۲۔ عبداللہ بن شداد بن الھادؓ (بھانجا)
۳۔ عبیداللہ (ربیب) ۴۔ عبداللہ بن سلیطؓ (رضاعی بھائی)
۵۔ ابراہیم بن عبداللہ (بھانجے کا پوتا) ۶۔ یزید الاصم (بھانجا)
۷۔ عطاء بن یسار (مولیٰ) ۸۔ سلیمان بن یسار (مولیٰ)
۹۔ عبدالرحمٰن بن السائب (بھائی کا پوتا) ۱۰۔ ندبۃ (مولاۃ)

۴۔ بیتِ اسماء بنت ابی بکرؓ

حضرت اسماءؓ کے گھر میں ان سے علم حدیث حاصل کرنے والے رشتہ دار مرد و خواتین اور موالی کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ عبداللہ بن الزبیرؓ (بیٹا) ۲۔ عروۃ بن الزبیر (بیٹا)
۳۔ عباد بن عبداللہ (پوتا) ۴۔ عبداللہ بن عروہ (پوتا)
۵۔ عباد بن حمزہ بن عبداللہ (پوتے کا بیٹا)
۶۔ فاطمہ بنت المنذر (پوتی) ۷۔ ابوبکر بن عبداللہ (پوتا)

۸۔ عامر بن عبداللہ (پوتا) ۹۔ محمد بن عباد بن عبداللہ (پوتے کا بیٹا)
۱۰۔ عبداللہ بن کیسان (مولیٰ)

۵۔ بیتِ اسماء بنت عمیسؓ

حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے تلامذہ میں سے ان کے رشتہ دار اور موالی یہ ہیں:

۱۔ عبداللہ بن عباسؓ (بھانجا) ۲۔ عبداللہ بن جعفر (بیٹا)
۳۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد (بھانجا) ۴۔ قاسم بن محمد بن ابی بکر (پوتا)
۵۔ ام عون بنت محمد بن جعفر (پوتی) ۶۔ فاطمہ بنت علی (سوتیلی بیٹی)
۷۔ عروہ بن الزبیر (سوتیلہ نواسہ)

۶۔ بیتِ ام حبیبہؓ

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی مکتب الحدیث بن چکا تھا، اس کے طالبانِ علم میں درج ذیل رشتہ دار شامل ہیں:

۱۔ معاویہؓ (بھائی) ۲۔ عنبسہ بن ابی سفیانؓ (بھائی)
۳۔ عبداللہ بن عتبہ بن ابی سفیان (بھتیجا)
۴۔ ابوسفیان بن سعید بن المغیرہ (بھانجا)
۵۔ حبیبہ بنت عبداللہ بن جحش (بیٹی)
۶۔ سالم بن شوال (مولیٰ) ۷۔ ابوالجراح (مولیٰ)

۷۔ بیت ام الفضلؓ

حضرت ام الفضل بنت الحارث الہلالیہؓ سے علم حدیث لینے والوں میں گھر کے بہت سے افراد شامل تھے، جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ عبداللہ بن عباسؓ (بیٹا) ۲۔ تمام بن عباس (بیٹا)
۳۔ ہند بنت الحارث (بھانجے کی بیوی)

۴۔ عمیر (مولیٰ) ۵۔ کریب (بیٹے کا مولیٰ)

۸۔ بیت ام ہانیؓ

حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں ان سے علم حدیث میں تلمذ حاصل کرنے والے رشتہ دار مرد و خواتین اور موالی درج ذیل ہیں:

۱۔ جعدہ (بیٹا) ۲۔ ہارون (پوتا)

۳۔ یحییٰ بن جعدہ (پوتا) ۴۔ ابومرّۃ (مولیٰ)

۵۔ ابوصالح (مولیٰ)

۹۔ بیت الشفاء بنت عبداللہؓ

حضرت شفاءؓ معلمۃ النساءؐ کے لقب سے ملقب کی گئی ہیں۔ آپ کے رشتہ دار تلامذہ یہ ہیں:

۱۔ سلیمان بن ابی حثمہ (صاحب زادہ)

۲۔ ابوبکر بن سلیمان (پوتا)

۳۔ عثمان بن سلیمان (پوتا)

۴۔ ابواسحاق (مولیٰ)

۱۰۔ بیتِ صفیہ بنت شیبہؓ

حضرت صفیہؓ کے اس گھریلو ادارۂ حدیث کے رشتہ دار تلامذہ یہ ہیں:

۱۔ منصور بن عبدالرحمٰن الحجبی (بیٹا)

۲۔ عبدالحمید بن جبیر بن شیبہ (بھتیجا)

۳۔ مسافح بن عبداللہ بن شیبہ (بھانجا)

۴۔ مصعب بن ثابتہ (بھتیجے کا پوتا)

۵۔ محمد بن عمران الحجبی (نواسہ)

یہ فہرست صرف دس گھرانوں کی ہے، اگر کم از کم دو تلامذہ پر مشتمل گھروں کو شمار

کیا جائے تو ان کی تعداد تیس سے بھی زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فہرست صرف رشتہ دار مرد وخواتین اور موالی کے ناموں پر مشتمل ہے۔ غیر رشتہ دار مرد اور خواتین تلامذہ کو شامل کیا جائے تو یہ ان نسائی درس گاہوں کے طلبہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اس محدود فہرست سے مدینہ منورہ میں صحابیات کی درس گاہوں اور خواتین کے اشاعتِ علم کے جذبہ اور کردار کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں شریعتِ اسلامیہ کے مصادر کی حفاظت اور اشاعت کی ایک تحریک برپا تھی، جس میں مرد اور خواتین دونوں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔

حواشی ومراجع

۱۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر ۴۲۳۰

۲۔ ایضاً، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب تعلیم النبی امتہ من الرجال والنساء، ۷۳۱۰

۳۔ مسند احمد، حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا، ح:۲۶۶۰۲، ج:۶، ص:۳۳۰

۴۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب وصل الشعر، ۵۹۳۵

۵۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب من اکل فی عاشوراء، ۲۶۲۹

۶۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب نوم المرأۃ فی المسجد، ۴۳۹

۷۔ مسند احمد، حدیث حفصہ: ۲۶۵۰۶

۸۔ الإصابۃ، ج:۸، ص ۱۹۶

۹۔ الإستیعاب، ج:۴، ص:۱۸۵۶

۱۰۔ الطبقات، ج:۸، ص:۲۲۹

۱۱۔ مسلم، کتاب الفتن، باب قصۃ الجساسہ، ۷۳۸۶

۱۲۔ مسلم، کتاب الجمعۃ باب تحفیف الصلاۃ و الخطبہ، ۲۰۱۲

۱۳۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ ﴿لا تحرک به لسانک﴾

۱۴۔ ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجآء فی الصلوٰۃ بعد العصر، ۱۸۴

۱۵ الإصابۃ، ج:۸،ص:۲۰۲۔
۱۶ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم (۵۰)، ۱۳۱، ص:۱۴۔
۱۷ بخاری، کتاب اخبار الآحاد، باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد، ۲۴۶۷
۱۸ مسند أحمد، حدیث میمونہ، ۲۶۸۸۴
۱۹ تہذیب التہذیب، ج:۶، ص:۵۵۲
۲۰ ایضاً ، ص:۵۵۳
۲۱ ایضاً، ج:۶، ص:۶۰۷
۲۲ تہذیب التہذیب، ج:۶، ص:۵۲۹
۲۳ ایضاً ،ص:۵۸۰
۲۴ ایضاً، ص:۵۹۲
۲۵ ایضاً ، ج:۶، ص:۵۶۲
۲۶ ایضاً، ج:۶، ص:۵۵۵
۲۷ تہذیب التہذیب، ج:۶، ص:۶۱۰
۲۸ مسند احمد، حدیث عائشہ، ج:۶
۲۹ مسند احمد، حدیث ام عطیہ الانصاریہ، ۲۷۳۷۶
۳۰ أسد الغابۃ، ج:۶، ص:۱۹
۳۱ صحیح بخاری، کتاب الہبۃ وفضلہا، باب من اھدی الی صاحبہ، ۲۵۸۱
۳۲ جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب من فضل عائشۃ، ۳۸۸۴
۳۳ الاستیعاب، ج:۴، ص:۱۷
۳۴ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب طواف النساء مع الرجال، ۱۶۱۸
۳۵ مسند احمد، مسند عائشہ رضی اللہ عنہا
۳۶ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب رضاعۃ الکبیر، ۳۶۰۴

☆☆☆

ترجمہ وتلخیص

قرآن کریم کا سائنسی اعجاز
غور وفکر کے چند پہلو

ڈاکٹر محمد عبدالتواب حامد
مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سائنس کا تعلق طبعیات سے ہے۔قرآن نے اپنے مقاصد کے اثبات کے لیے طبعیات سے بھی دلائل پیش کیے ہیں،لیکن بعض اوقات ہر طبعی انکشاف کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس میں قرآن کا منشا سامنے نہیں رہ پاتا۔ قرآن اصلاً انسانوں کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ دکھانا چاہتا ہے۔اس کے لیے اس کے دلائل تاریخی بھی ہیں،نفسیاتی بھی، سماجی بھی اور طبعیاتی بھی۔اس مضمون میں جادۂ اعتدال کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (جلال الدین)

سائنسی اعجازِ قرآن اور سائنسی تفسیر میں فرق

قرآن کریم کے سائنسی اعجاز پر بحث سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی اعجاز اور سائنسی تفسیر میں فرق بیان کردیا جائے، اس لیے کہ اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے لوگ دونوں کو خلط ملط کردیتے ہیں۔

سائنسی تفسیر کی تعریف ڈاکٹر محمد حسین ذہبی نے یہ کی ہے:

''اس سے مراد وہ طریقۂ تفسیر ہے جس میں قرآن کی عبارت میں سائنسی اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے مختلف علوم اور فلسفیانہ آراء مستنبط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے''۔[۱]

یہ تعریف اصلاً استاذ امین الخولی کی ہے، جسے انھوں نے اپنی کتاب:

التفسیر – معالم حیاته ومنهجه الیوم میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر فہد الرومی نے لکھا ہے:

''اس سے مراد قرآن کریم کی آیاتِ کائنات اور تجرباتی علوم کی ایجادات کے درمیان ربط ظاہر کرنے کے لیے مفسّر کی ایسی کوشش ہے جس سے قرآن کا اعجاز نمایاں ہوجائے اور یہ واضح ہوجائے کہ وہ انسانی کاوش نہیں ہے، بلکہ اسے نازل کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہ کہ وہ ہر زمان ومکان کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے''۔[۲]

شیخ اہدل اس کی یہ تعریف کرتے ہیں:

''سائنسی تفسیر سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیاتِ کائنات کی تفسیر سائنسی معلومات کی روشنی میں کی جائے، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ اس طرح اس تعریف میں صحیح اور غلط دونوں تفسیریں آجاتی ہیں''۔[۳]

مذکورہ بالا تعریفات میں شیخ اہدل کی تعریف زیادہ درست اور جامع معلوم ہوتی ہے۔

رہا سائنسی اعجازِ قرآن تو شیخ زندانی نے اس کی تین تعریفیں ذکر کی ہیں:

۱- ''اس سے مراد قرآن کا کسی ایسی حقیقت کی خبر دینا ہے جس کا اثبات تجرباتی علم (سائنس) سے ہوا ہو اور اس کا ادراک عہدِ رسالت یا زمانۂ نزولِ وحی میں انسانی علمی وسائل کے ذریعے ممکن نہ رہا ہو''۔

۲- ''اس سے مراد جدید ثابت شدہ اور مستقل سائنسی اکتشافات کے ذریعے قرآن کریم میں وارد حقائق کا اثبات کرنا ہے، ایسے دلائل کے ذریعے جو قطعی اور یقینی ہوں اور جن پر ماہرین کا اتفاق ہو''۔

۳- ''اس سے مراد وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہونے والے علم الٰہی کی سچائی کا اظہار ہے، جس سے اس کا امر واقعہ ہونا ثابت ہوجائے اور کوئی شخص اس کی نسبت حضرت محمد ﷺ یا آپ کے زمانے کے کسی انسان کی طرف نہ کرسکے''۔

یہ تینوں تعریفیں صحیح اور قابلِ قبول ہیں، لیکن ان میں صحیح ترین اور دقیق ترین اول الذکر تعریف معلوم ہوتی ہے۔

قرآن کا سائنسی اعجاز - چند حقائق

بعض قرآنی آیات کو علمی (سائنسی) قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دیگر آیات، جن کا ان علوم سے تعلق نہیں ہے، ان کے علمی ہونے کی نفی کی جارہی ہے۔ بلکہ اس سے مراد تجرباتی علم ہے، تاکہ اس سے فلسفیانہ، معاشرتی اور اخلاقی علوم خارج ہوجائیں، اس لیے کہ قرآن ان علوم کی مبادیات پر مشتمل ہے اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، کسی انسان کا گھڑا ہوا نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کریم میں سائنسی اعجاز کا مسئلہ دو بنیادی حقیقتوں پر قائم ہے:

اول یہ کہ سائنسی اعجاز بذاتِ خود مقصود نہیں ہے۔

دوم یہ کہ قرآن کریم کتابِ ہدایت ہے اور اس ہدایت کے ذرائع میں سے وہ اہم علمی وسائنسی دلائل بھی ہیں جو کتابِ عزیز کی آیات میں پائے جاتے ہیں۔

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن کریم اس حیثیت سے بھی معجزہ ہے کہ وہ ایسے علمی حقائق پر مشتمل ہے جن کا انکشاف عہدِ نزول قرآن کے بعد کے زمانوں میں ہوا ہے۔ اس سے قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ ان حقائق کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ علماء کا یہ اتفاق اجمالی طور پر ہے۔ رہی تفصیل تو اس میں ان کے درمیان کسی قدر اختلاف ہے، اس کا سبب علوم و معارف، سائنسی ایجادات اور حقائقِ علوم سے واقفیت میں ان کا تفاوت ہے۔

قرآن کریم کا مطالعہ اور اس کی آیات کا تتبّع کرنے والا بہت سی ایسی آیات پاتا ہے (بعض محققین نے ان کی تعداد نوسو (۹۰۰) سے زائد بتائی ہے) جن میں اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنتوں اور نظام اور اپنی مخلوقات کے ساتھ اس کی عنایات کا بیان ہے، اس لیے قرآنی مطالعات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس اہم پہلو کی جانب اپنی توجہ مبذول کریں اور قرآن کریم کے ان عظیم اور دقیق حقائق کو واشگاف کریں جو ایک ایسے امّی شخص کی زبان سے ظاہر ہوئے ہیں جسے ان علوم کی ادنیٰ واقفیت بھی نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ان علوم کو اس ذاتِ گرامی سے

حاصل کیا ہے جو آسمان اور زمین کے تمام اسرار سے واقف ہے۔ارشادِ باری ہے:

قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِیْ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ کَانَ غَفُوراً رَّحِیْماً۔(الفرقان:٦)	ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمان کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور ورحیم ہے۔

شیخ مصطفیٰ صادق الرافعیؒ فرماتے ہیں:

''قرآن میں کائناتی اور سائنسی آیات کی موجودگی اس کے ایک دوسرے اعجاز کی دلیل ہے۔اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ زمانہ بحث و دلیل پر قائم علمی رخ پر رواں دواں ہے، انسانیت اپنے عہدِ عروج میں اسی راہ پر گام زن ہے اور مذہب بہت جلد عقلی بنیادوں پر استوار ہوگا۔قرآن میں اس پہلو کی رعایت زمانہ میں اس کے وجود میں آنے سے چودہ صدیوں پہلے، غیب سے ظاہر ہونے والی کھلی شہادت ہے، جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر اگر صبح روشن ہوگئی ہو، لیکن بعض لوگ سو رہے ہوں، انھیں صبح کا پتا نہ چلا ہو تو یہ ان کی نیند کا قصور ہے، بعض دوسرے لوگ ہیں جو اندھے پن میں مبتلا ہیں، جس کی بنا پر وہ صبح کو دیکھنے پر قادر نہیں، لیکن بہ ہر حال یہ حقیقت ہے کہ صبح نمودار ہوگئی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا۔(الانعام:١٠٤)۵	اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔

موجودہ صورت حال

اس زمانے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور نئی ایجادات اور سائنسی اکتشافات کی کثرت کے سبب بہت سی ایسی تالیفات منظر عام پر آئی ہیں، جن میں قرآن کی سائنسی تفسیر بیان کی گئی ہے اور بہت سے شائقینِ علم ان تالیفات کی جانب مائل ہوئے ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کو اس اندازِ تفسیر یا اس وجہِ اعجاز میں ایک مناسب میدان ہاتھ لگا ہے، جس کے ذریعے وہ مؤثر انداز میں اسلام کی دعوت پیش کریں اور اس بات پر دلیل قائم کریں کہ قرآن انسانی کلام نہیں، بلکہ وحیِ الٰہی ہے اور وہ ایک حکیم وحمید ذات کی

جانب سے نازل ہوا ہے، خاص طور پر اس زمانے میں جب عربوں کی زبان دانی کم زور پڑ گئی ہے اور وہ قرآن کریم کے اعجازِ بیان کو محسوس کرنے پر قادر نہیں رہ گئے ہیں، دوسری طرف یہ سمجھا جا رہا ہے کہ یہ جدید (سائنسی) اعجاز عرب اور غیر عرب دونوں کو مخاطب کر سکتا ہے۔

یہ اہلِ قلم اور مفکّرین آیاتِ قرآنی کی اپنی سائنسی تفسیروں کو 'قرآن کے سائنسی اعجاز' کے عنوان سے پیش کرتے ہیں اور اسے اس زمانے میں قرآن کے وجوہِ اعجاز میں سب سے مشہور وجہ سمجھتے ہیں۔ چند سال پہلے سعودی عرب میں ایک بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جس کا نام **هيئة الاعجاز العلمي في القرآن و السنة** ہے۔ اس بورڈ کی جانب سے قرآن وسنت میں اعجاز کے موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور بہت سی کانفرنسیں منعقد کی گئی ہیں، اسی طرح اس نے مشرق ومغرب کے، مختلف علوم وفنون کے ماہرین، محققین اور سائنس دانوں سے، قرآن کا سائنسی اعجاز نمایاں کرنے میں مدد لی ہے، البتہ بعض علماء اس قسم کے اعجاز کے سلسلے میں تحفّظ رکھتے ہیں، اس لیے کہ اس موضوع پر لکھنے والے بعض لوگوں کی کتابوں میں ایسی بے بنیاد اور غیر معتدل باتیں آ گئی ہیں جو قرآن کی عظمت سے میل نہیں کھاتیں۔

اس موضوع پر لکھنے والے جن غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر میں بہت سے ان سائنسی نظریات پر بھروسہ کر لیا ہے جو ابھی قطعی طور پر ثابت شدہ نہیں ہیں اور دوسری جانب انھوں نے صحیح احادیث و روایات کو قبول کرنے سے اعراض کیا ہے، الفاظِ قرآنی کے مدلول سے بھی وہ واقف نہیں ہیں اور قطعی دلائل سے ثابت شدہ عقائد کی وہ کوئی پروا نہیں کرتے۔ مزید خرابی اس سے پیدا ہوئی کہ اس قسم کے موضوعات پر بہت سے ایسے لکھنے والے میدان میں آ گئے جنھیں نہ اسلامی علمی ورثہ سے کوئی خاص واقفیت تھی اور نہ وہ سائنسی علوم میں مہارت رکھتے تھے، اس بنا پر مارکیٹ میں ایسی کتابیں اور تحقیقات آ گئیں جن میں سے بہت سوں پر نظر ثانی اور اصلاح کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ درازؒ لکھتے ہیں:

''جوش میں آ کر بعض نئے مفسرین نے اس طریقہ کو استعمال کرنے میں اس

حد تک مبالغہ سے کام لیا کہ خود ایمان خطرہ میں پڑ گیا، اس لیے کہ اس سے یا تو نص کے مفہوم پر اعتماد میں کمی آتی ہے، کہ اس سے ایسی باتیں مستنبط کی جاتی ہیں جن کے، قرآنی الفاظ اور جملے متحمل نہیں ہوتے، یا سائنس دانوں کی آراء، یہاں تک کہ ان کے باہم متضاد مفروضات یا وہ نظریات جن کی صحت کو ثابت کرنا دشوار ہوتا ہے، ان پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرلیا جاتا ہے'' ۔[۶]

سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں:

''قرآنی اشارات کو سائنس کے جدید اور ہمہ آں متغیر نظریات پر محمول کرنے کی کوشش منہجی اعتبار سے بنیادی غلطی ہے۔ ساتھ ہی اس میں تین باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو قرآن کی عظمت وجلال کے شایانِ شان نہیں ہیں:

اول: اندرونی احساسِ شکست، جس کی بنا پر بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ سائنس کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ وہ قرآنی بیانات کو سائنس کے ذریعے ثابت کرنے یا ان پر سائنس سے استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جب کہ قرآن اپنے موضوع پر کامل اور اپنے بیان کردہ حقائق کے سلسلے میں آخری کتاب ہے اور سائنس کا حال یہ ہے کہ اس میں کل تک جو چیز ثابت تھی آج اس کی تردید ہو جاتی ہے۔

دوم: قرآن کے مزاج اور اس کے مقصدِ بعثت کے بارے میں غلط فہمی، جب کہ قرآن علی الاطلاق ایسی آخری حقیقت ہے جو انسانی وجود کی ایسی تشکیل کرتی ہے جو اس کائنات کے مزاج اور اس کے الٰہی ناموس سے ہم آہنگ ہو، تاکہ انسان اور کائنات میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو، بلکہ انسان کا کائنات سے قریبی تعلق استوار ہو جائے، وہ اس کے بعض اسرار جان لے اور اس کے بعض مظاہر کو اپنے کارِ خلافت میں استعمال کر سکے۔

سوم: نصوصِ قرآن کی بہ تکلّف اور دور از کار تاویل، کہ قرآنی آیات کو من چاہے معانی کا جامہ پہنایا جائے اور ان کے ساتھ ایسے سائنسی مفروضات اور نظریات کے پیچھے دوڑا جائے جو ثابت شدہ اور دائمی نہیں ہیں، بلکہ ہر دن ان میں نئی تحقیقات سامنے آتی رہتی ہے۔[۷]

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سائنس کے ذریعے کائنات، زندگی اور انسان کے بارے میں جن حقائق کا انکشاف ہوا ہے ان سے آیاتِ قرآنی کے فہم میں فائدہ نہ اٹھایا جائے، بلکہ ضروری ہے کہ آفاق وانفس میں سائنس کے ذریعے اللہ کی جن نشانیوں کا انکشاف ہورہا ہے ان پر ہم غور کریں۔ اس سے اس حکم الٰہی کی بھی تعمیل ہوگی جو اس نے اپنی آیات میں تدبر اور کائنات میں غور وفکر کرنے کے سلسلے میں دیا ہے۔

سائنسی تفسیر کے مخالفین

امام ابو اسحاق شاطبیؒ ان لوگوں میں سرفہرست ہیں جنھوں نے اس پہلو پر اعتراض کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سلفِ صالح یعنی صحابہ وتابعین قرآن اور اس کے علوم ومعارف سے سب سے زیادہ باخبر تھے اور ہمیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کسی نے اس موضوع پر کچھ بھی گفتگو کی ہو۔ ضروری ہے کہ فہم قرآن کے سلسلے میں مدد حاصل کرنے میں اس پر اکتفا کیا جائے جس کا علم خاص طور پر عربوں کی طرف منسوب ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فہمِ شریعت کے معاملے میں 'امیّین' یعنی عرب، جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، ان کے درمیان معروف امور کی پیروی کی جائے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں اظہارِ خیال کرنے والے کے لیے درست نہیں ہے کہ ان میں بہ تکلّف ایسے معانی مستنبط کرے جن کی عربوں کی زبان میں گنجائش نہ نکلتی ہو، بلکہ اس کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ بھی اتنا ہی آگے جائے جتنا عرب گئے تھے اور وہیں پر رک جائے جہاں عرب رک گئے تھے'' وہ مزید فرماتے ہیں کہ ''بہت سے لوگ قرآن میں اظہارِ خیال کرنے کے معاملے میں اس حد سے تجاوز کر گئے ہیں، چنانچہ انھوں نے اس میں متقدمین ومتاخرین کے تمام قابل ذکر علوم، مثلاً طبیعیات، تعلیمات اور منطق وغیرہ کو شامل کر دیا ہے''۔[۸]

ان مخالفین میں سے ابوحیان اندلسیؒ بھی ہیں، جنھوں نے اپنی تفسیر میں امام رازیؒ پر تنقید کی ہے کہ وہ اپنی تفسیر اور دیگر کتابوں میں مختلف علوم کو جمع کرتے ہیں اور کسی

موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک علم سے دوسرے علم کے دائرہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

''ان کا یہی معاملہ علوم کے سلسلے میں ہے۔وہ مختلف علوم کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ بحث کرتے کرتے ایک علم سے دوسرے علم میں جا پہنچتے ہیں۔ ہمارے استاذ علامہ ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفیؒ کہا کرتے تھے: ''جب تم دیکھو کہ کوئی شخص بحث و تحقیق یا تصنیف و تالیف میں ایک فن سے دوسرے فن میں پہنچ جاتا ہو تو جان لو کہ یا تو اس کا سبب اس فن میں اس کی کم علمی ہے یا اس کے ذہن میں مباحث پوری طرح واضح نہیں ہیں، اسے موضوع کا بہ خوبی ادراک نہیں ہے اور وہ گمان کرتا ہے کہ باہم مختلف چیزیں مماثل ہیں''۔[۹]

موجودہ دور میں سائنسی تفسیر کے مخالفین میں امین الخولی، محمد عزہ دروزہ، عباس محمود العقاد، صبحی صالح، سید قطب اور محمد حسین ذہبی قابلِ ذکر ہیں۔ڈاکٹر ذہبی نے اس پر متعدد پہلوؤں سے اعتراض کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''اول: لغوی پہلو سے: زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے قرآنی الفاظ کی دلالتیں بدل گئی ہیں اور ان میں توسّع آ گیا ہے۔تو کیا یہ بات قرینِ عقل ہوگی کہ الفاظِ قرآن کے فہم میں ہم بھی اتنے ہی توسّع سے کام لیں اور ان سے وہ معانی مستنبط کریں جنھیں جدید اصطلاحات کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

دوم: بلاغی پہلو سے: بلاغت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات مطابقِ حال کہی جائے۔سائنسی تفسیر سے قرآن کی بلاغت کو ضرر پہنچتا ہے، اس لیے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں جن لوگوں کو مخاطب بنایا گیا اگر وہ ان معانی سے ناواقف تھے جنھیں تفسیر میں بیان کیا جاتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ انھیں وہ بتانا چاہتا تھا تو اس سے لازم آتا ہے کہ قرآن غیر بلیغ ہے، اس لیے کہ اس نے مخاطبین کے حالات کی رعایت نہیں کی اور اگر وہ ان معانی کو جانتے تھے تو کیوں عربوں کی علمی ترقی نہیں ہوئی، جب کہ قرآن میں اولین و آخرین کے تمام علوم پائے جاتے تھے۔

سوم: اعتقادی پہلو سے: اگر ہم ان لوگوں کا مسلک اختیار کریں جو قرآن سے

ہر چیز مستنبط کرنے لگتے ہیں اور اس کو تمام علوم کا سرچشمہ بنادیں تو قرآن کے سلسلے میں مسلمانوں کے عقیدہ کو مشکوک بنادیں گے۔ اس لیے کہ سائنسی علوم کے قواعد و نظریات دائمی اور اٹل نہیں ہیں۔ اگر ہم قرآن سے جدید سائنسی نظریات مستنبط کرنے لگیں، پھر یہ نظریات غلط قرار پا جائیں تو اس سے قرآن کریم پر مسلمانوں کا اعتقاد متزلزل ہو جائے گا، اس لیے کہ قرآن کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا جائز نہیں ہے کہ کل اس کی جو بات صحیح تھی وہ آج غلط ہو سکتی ہے''۔[۱۰]

سائنسی تفسیر پر اعتراض کرنے والے اور بھی بعض دلائل پیش کرتے ہیں، جنھیں ہم طوالت کے اندیشہ سے ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

سائنسی تفسیر کے مؤیّدین

جو حضرات قرآن کی سائنسی تفسیر کی تائید کرتے ہیں ان کے نقطہ ہائے نظر میں کچھ اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض مبنی بر اعتدال ہیں تو بعض میں غلو پایا جاتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی دلیلیں ہیں۔ سائنسی تفسیر کے زبردست مؤیّدین میں سے ایک امام ابوحامد الغزالیؒ ہیں۔ انھوں نے احیاء العلوم میں لکھا ہے: ''وہ نظریات اور معقولات جن کے فہم میں غور و فکر کرنے والوں کو دشواری اور ان کے درمیان اختلاف ہوا ہے، قرآن میں ان کی طرف اشارے اور دلالتیں پائی جاتی ہیں۔ مخصوص اہلِ فہم ہی ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ استنباطات ظاہرِ تفسیر سے ٹکراتے نہ ہوں، وہ اسے مکمل کرتے ہوں نہ کہ اس کا بدل ہوں''۔

مؤیّدین میں امام فخر الدین رازیؒ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں مختلف طبیعیاتی علوم، فلکیات اور علم نجوم وغیرہ کی تفصیلات ذکر کی ہیں۔ ان میں امام زرکشیؒ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب **البرھان فی علوم القرآن** میں ایک خاص فصل قائم کی ہے جس کا عنوان یہ ہے ''**فی القرآن علم الاولین و الآخرین**''، یعنی قرآن میں قدیم و جدید زمانوں کے تمام علوم ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے نقل کیا ہے کہ ابوالفضل المرسیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ''قرآن میں اوّلین و آخرین کے علوم جمع ہیں۔ ان کا علم سب سے

پہلے اللہ تعالیٰ کو تھا، پھر اس نے اپنے رسول کو ان سے باخبر کیا (سوائے کچھ چیزوں کے، جن کا علم اس نے اپنے پاس محفوظ رکھا ہے) پھر ان سے کبارِ صحابہ مثلاً خلفائے اربعہ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ نے اخذ کیا، یہاں تک کہ بعض صحابہ کہا کرتے تھے: ''اگر اونٹ کو باندھنے والی کوئی رسّی بھی کھوجائے تو میں اسے کتاب اللہ میں پالوں گا''، پھر ان سے تابعین نے اخذ کیا، اس کے بعد ہمتیں پست ہوگئیں، عزائم میں فتور آ گیا اور اہل علم ان علوم وفنون کے حامل نہ رہے جن سے صحابہ وتابعین بہرہ ور تھے''۔[۱۱]

خود امام سیوطیؒ کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''اللہ کی کتابِ عزیز میں ہر چیز پائی جاتی ہے۔ رہے مختلف علوم تو ان کے ہر باب اور ہر مسئلے کی اصل قرآن میں موجود ہے۔ اس میں عجیب وغریب مخلوقات اور آسمانوں، زمین، افق اعلیٰ اور زیرِ زمین پائی جانے والی چیزوں کا بیان، ابتدائے تخلیق کی تفصیل، مشہور پیغمبروں اور فرشتوں کے نام اور گزشتہ قوموں کے حالات مذکور ہیں''۔[۱۲]

مؤیّدین میں امام ابن قیّمؒ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف **کتاب الفوائد المشوّق الی علوم القرآن و علم البیان** کے مقدمے میں لکھا ہے:

''قرآن کے ایک ایک حرف سے حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں ... اس کی ہر سورت سے اوائل و اواخر کے علوم کا اظہار ہوتا ہے''۔[۱۳]

آگے لکھتے ہیں: ''قرآن ہر علم وحکمت کا سرچشمہ ہے''۔[۱۴]

سائنسی تفسیر کی حمایت کرنے والے نمایاں متاخرین میں شیخ طنطاوی جوہری بھی ہیں۔ ان کی تفسیر جواہر القرآن قرآن کریم کی سائنسی تفسیر کی نمائندہ کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے عجائباتِ کائنات، اسرارِ علوم اور سائنسی مفروضات کی خاصی بڑی مقدار شامل کر دی ہے۔ وہ اپنی تفسیر کی بنیاد عموماً ان سائنسی اصولوں اور مفروضات پر رکھتے ہیں جو عصر حاضر کی تحقیقات سے حاصل ہوئے ہیں اور آیتِ قرآنی کی تشریح وتوضیح کرتے کرتے ان سائنسی اصولوں اور مفروضات کو بیان کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات وہ آیات قرآنی میں پائے جانے والے سائنسی اشارات کا موازنہ سائنس کے اصولوں سے کرنے لگتے ہیں اور

تائید میں مختلف علومِ کائنات کے ماہر مغربی سائنس دانوں کی آراء پیش کرنے لگتے ہیں۔

اس تفسیر پر لوگوں نے بہت تنقید کی ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اسے کسی بھی طور پر تفسیر کی کتاب نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس کے مؤلف نے اس میں بہت سی غیر ضروری تفصیلات شامل کر دی ہیں اور بلاضرورت اسے مختلف سائنسی علوم سے بھر دیا ہے۔ شیخ منّاع القطّان فرماتے ہیں:

''ہماری نظر میں شیخ طنطاوی جوہری نے اس تفسیر کو لکھ کر بہت برا کیا، حالاں کہ وہ گمان کر رہے ہیں کہ انھوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ ان کی تفسیر کو بہت سے اہل علم کے نزدیک مقبولیت نہیں ملی ہے، اس لیے کہ اس میں آیات سے دور دراز معانی مستنبط کرنے کے لیے بہت کھینچ تان کی گئی ہے۔ اسی لیے اس تفسیر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں ہر چیز ہے سوائے تفسیر کے''۔[۱۵]

سائنسی تفسیر کے مؤیّدین میں سے شیخ طاہر بن عاشور بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر التحریر والتنویر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تفسیر میں مختلف علوم سے استفادہ ضروری ہے، اس لیے کہ اس سے آیت کا معنیٰ مزید واضح اور روشن اور قرآن کا مدّعا مزید پختہ اور راسخ ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بسا اوقات سائنس کے بعض مسائل کا آیاتِ قرآنی کی تفسیر سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان کو اسی طرح پیش کیا جاسکتا ہے جس طرح ہم کسی قرآنی دلیل کے اثبات کے لیے کوئی کلامی مسئلہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً آیت لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ الانبیاء:۲۲ (اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا) کی تشریح میں برہان التمانع اور آیت وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ۔ الذاریات:۴۷ (آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں) کی تشریح میں مسألۃ المتشابہ سے بحث کرتے ہیں''۔

ابن عاشورؒ جب ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن میں آیات کی سائنسی تفسیر کی جاسکتی ہے تو ساتھ ہی وہ اس کی کچھ شرطیں بھی بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ''اس کے

قابلِ قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس میں ایجاز و اختصار کا طریقہ اپنایا جائے، سائنسی معلومات کا صرف خلاصہ بیان کیا جائے، بہت زیادہ تفصیل نہ ذکر کی جائے کہ وہی مقصود معلوم ہونے لگے''۔ آگے انھوں نے امام شاطبیؒ کا، جو سائنسی تفسیر کے مخالفین میں سے ہیں، رد کیا ہے، ان کے دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ بے بنیاد بات ہے۔ اس کی چھ دلیلیں ہیں۔ اول: جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ عربوں کے حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو، حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ دوم: قرآن کا مقصد دعوت اسلامی کی اشاعت ہے اور یہ رہتی دنیا تک باقی رہنے والا معجزہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس میں ایسی باتیں ہوں جو سائنسی ترقی کے زمانے کے لوگوں کے فہم کے مطابق ہوں۔ سوم: سلف نے کہا ہے کہ ''قرآن ایسی کتاب ہے جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے'' اس سے ان کی مراد قرآن کے معانی ہیں۔ اب اگر امام شاطبی کی بات صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے عجائبات اس کے معانی کے محصور ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ چہارم: اس کا کمالِ اعجاز یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں ایجاز ہونے کے باوجود اس کے معانی میں کثرت ہو کہ وہ کتابوں میں نہ سما سکیں۔ پنجم: ضروری ہے کہ مخاطبینِ اول نے آیاتِ قرآن کے معانی اصلیہ سمجھ لیے ہوں۔ رہے زائد معانی تو ممکن ہے کہ انھیں کچھ لوگ سمجھ لیں اور کچھ نہ سمجھ پائیں۔ بسا اوقات جس تک بات پہنچائی جاتی ہے وہ بات پہنچانے والے سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے۔ ششم: وہ باتیں جن کا تعلق مقاصد قرآن سے ہے، ان کے بارے میں یہ چیز قابل تسلیم نہیں ہے کہ سلف ان کی تشریح میں ظاہر آیت پر توقف کرتے تھے، بلکہ ان میں انھوں نے خوب تشریح و توضیح سے کام لیا ہے اور مختلف علوم کی تفصیل پیش کی ہے۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے ہم بھی ایسے علوم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مقاصد قرآن کی خدمت کرتے ہوں اور جن سے علوم اسلامی کی وسعت کا اظہار ہوتا ہو۔'' [۱۶]

شیخ طاہر بن عاشورؒ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اگرچہ اہم اور قیمتی ہے، لیکن اس سے امام شاطبیؒ کی باتوں کی بالکلیہ تردید نہیں ہوتی۔

اپنی تحریروں میں آیاتِ قرآنی کی سائنسی تفسیر کا اہتمام کرنے والوں میں شیخ رشید رضا، شیخ محمد مصطفیٰ المراغی، محمد فرید وجدی، محمد احمد الغمر اوی، حنفی احمد اور شیخ محمد متولی شعراوی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم ان حضرات کی تصنیفات اور ان کے افکار پر تفصیل سے بحث کرتے۔

سائنسی تفسیر کے سلسلے میں اہل علم کا جو اختلاف ہے وہ اوپر گزرا۔ رہا سائنسی اعجاز تو اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے (سائنسی تفسیر اور سائنسی اعجاز میں فرق شروع میں واضح کیا جا چکا ہے)۔

سائنسی اعجاز کے دلائل

اول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (یونس:۳۹)

اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچّو) جھٹلا دیا۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن بے شمار وجوہ سے معجزہ ہے۔ مگر انھوں نے قبل اس کے کہ اس میں غور وفکر کرتے یا اس نے مستقبل کی جن چیزوں کی خبر دی ہے ان کے پیش آنے کا انتظار کرتے، اول وہلہ میں اسے جھٹلا دیا۔ یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ قرآن میں بعض ایسے حقائق پائے جاتے ہیں جو آئندہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ واضح ہوں گے۔

دوم: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔ (حم السجدۃ:۵۳)

عن قریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟

اس آیت کی تشریح میں علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عن قریب ہم قرآن کے برحق اور منزّل من اللہ ہونے پر اپنے دلائل و براہین ان پر ظاہر کردیں گے۔ فی الآفاق سے مراد خارجی دلائل ہیں، مثلاً فتوحات، ممالک و مذاہب پر اسلام کا غلبہ اور فی انفسھم سے مراد داخلی دلائل ہیں، یعنی غزوۂ بدر اور فتح مکہ جیسے واقعات۔ یہ مجاہد، حسن اور سدّی کا قول ہے...اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا جسم کن چیزوں سے مرکب ہے؟ اس میں کون کون سے مادے اور اخلاط پائے جاتے ہیں؟ اور اس سے کیسے افعال صادر ہوتے ہیں، جیسا کہ علم تشریح البدن میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی کاری گری کی حکمت واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی فطرت میں کون سے اچھے اور برے اخلاق ودیعت کیے گئے ہیں؟ اور کس طرح وہ تقدیر الٰہی کے تابع محض ہوکر زندگی گزار رہے ہیں کہ اس سے ذرا بھی تجاوز نہیں کرسکتے''۔ ۱۷

سوم: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

ما من الأنبیاء نبیّ الا أعطی من الآیات ما مثلہ آمن علیہ البشر، وانما کان الذی اوتیتہ وحیاً أوحاہ اللہ الیّ، فأرجو ان اکون اکثرھم تابعاً یوم القیامۃ۔ ۱۸

اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء بھی بھیجے، ان میں سے ہر ایک کو ایسی نشانی دی جسے دیکھ کر لوگ ایمان لے آئے۔ لیکن اس نے مجھے جو نشانی عطا کی ہے وہ قرآن کی شکل میں ہے جسے اس نے میری طرف وحی کی ہے۔ اس بنا پر مجھے امید ہے کہ روزِ قیامت میرے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

قرآن میں سائنسی اعجاز کے ضوابط

سائنسی اعجاز کو نمایاں کرتے وقت چند اہم ضوابط کی پابندی ضروری ہے، جو درج ذیل ہیں:

اول: یہ عقیدہ ہو کہ قرآن اول درجہ کی کتابِ ہدایت ہے، سائنس اور

طبیعیات کی کتاب نہیں ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی ان کے خالق کی طرف رہ نمائی ہو، وہ زمین میں خلافت قائم کریں، جس کی انھیں ذمہ داری سونپی گئی ہے اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوں، جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے آیاتِ کائنات سے متعلق قرآنی مطالعات کو اسی دائرے میں رہنا چاہیے اور اس پر کسی دوسرے پہلو کو ترجیح نہیں دینی چاہیے۔ جائز نہیں کہ قرآن کے ساتھ کسی ایسی چیز کا اضافہ کر دیا جائے جس کا وہ تقاضا نہ کرتا ہو اور نہ یہ صحیح ہے کہ کسی ایسی چیز کا انکار کر دیا جائے جس کا وہ تقاضا کرتا ہو۔

دوم: عربی زبان، جس میں قرآن کا نزول ہوا ہے، اس کی دلالتوں کی پابندی کی جائے، اس کے مفردات، تراکیب، اسالیب، عموم وخصوص، اطلاق وتقیید اور اجمال و بیان وغیرہ کو ملحوظ رکھا جائے، اس کے متعیّن قواعد کی رعایت کی جائے، مثلاً مطلق کو مقیّد پر اور عام کو خاص پر محمول کرنا، لفظ کے حقیقی معنیٰ مراد لینا، الّا یہ کہ کسی وجہ سے مجازی معنیٰ لینا ضروری ہو، اور علومِ لغت اور اصولِ تفسیر میں سے ان چیزوں کو ضرور پیش نظر رکھا جائے جن پر معانیٔ آیات کا فہم موقوف ہو۔

سوم: اعجازِ قرآن کی وضاحت میں دور دراز تاویلات سے احتراز کیا جائے، قوی دلیل کے بعد آیت کے ظاہری مفہوم سے انحراف نہ کیا جائے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ قرآنی منہج کی پیروی کی جائے اور قرآنی نصوص سے وہ معانی نہ نکالے جائیں جو بہ ظاہر ان سے نہ نکلتے ہوں۔ اسی طرح مناسب یہ ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر کو سائنس کی کتاب نہ بنا دیں کہ اس کو مختلف سائنسی علوم سے بھر دیں اور اس معاملے میں حد اعتدال سے تجاوز کر جائیں۔

چہارم: علمی مضامین کے اظہار میں قرآنی اسلوب کی لچک سے واقفیت حاصل کی جائے اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ آیت کی تاویل میں کون کون سی توجیہیں قابلِ قبول ہوسکتی ہیں۔ اس لیے قرآن کے کسی لفظ یا عبارت کو سمجھنے کی کوشش کرتے وقت اس لفظ کی حقیقی اور مجازی دلالتوں اور عربی زبان میں اس کے استعمالات کی

طرف ضرور رجوع کیا جائے، تاکہ اس میں جن معانی کی گنجائش نکل سکتی ہو، تفسیر کرتے وقت وہ ذہن میں واضح رہیں۔

پنجم: کائنات اور انفس و آفاق سے متعلق آیاتِ الٰہی میں غور وخوض اور اللہ کی سنتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے علم و معرفت کے بارے میں قرآنی منہج کی پیروی کی جائے۔ چوں کہ کائنات کا نظام اللہ تعالیٰ کے طبیعی قوانین (سنن) پر قائم ہے اور وہ انہی کے مطابق کائنات کو چلا رہا ہے، اس لیے جو شخص ان طبیعی قوانین کو جان لے گا وہ اپنے فائدے کے لیے کائنات کو مسخّر کر سکے گا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کے مطابق بہتر وسائلِ زندگی فراہم اور مادی ترقی حاصل کر سکے گا، خواہ وہ کسی بھی عقیدے کا ماننے والا ہو اور کیسی بھی زندگی گزارتا ہو۔

ششم: تفسیر کرنے والا آیت کا مفہوم قرآن کی دیگر آیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرے، پھر سنتِ نبوی، پھر اقوال صحابہ، پھر اقوالِ تابعین سے رجوع کرے۔ اصطلاحی طور پر اسے 'تفسیر ماثور' کہتے ہیں، غرض یہ کہ تفسیر کے اصول وقواعد کو ملحوظ رکھے۔

ہفتم: قرآن کے بیان کردہ حقائق کو محلِّ نظر نہ بنا دیا جائے، بلکہ ضروری ہے کہ ان کو اصل قرار دیا جائے۔ پھر جو چیز اس کے موافق ہو اسے قبول کیا جائے اور جو چیز اس کے مخالف ہو اس کو رد کر دیا جائے۔

ہشتم: قرآن کی تفسیر سائنس کی صرف یقینی اور ثابت شدہ معلومات سے کی جائے، تفسیر آیات کے ضمن میں صرف سائنسی حقائق پر اکتفا کیا جائے اور ان سائنسی نظریات کی جانب توجہ نہ دی جائے جو ابھی حقائق کے درجے تک نہ پہنچے ہوں اور انھیں قطعاً ذکر نہ کیا جائے، اس لیے کہ کسی آیت کی تفسیر میں کسی ایسے سائنسی نظریہ کو پیش کرنا جس میں تبدیلی ہو سکتی ہو، یا بعد میں وہ غلط ثابت ہو سکتا ہو، اس سے قارئین کے ذہن میں وہ نظریہ بیٹھ جائے گا اور بعد میں اس کے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں وہ آیت کے اپنے فہم کے بارے میں ذہنی الجھن اور انتشار کا شکار ہوں گے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ کتب تفسیر میں اسرائیلیات کی بھرمار کے سبب بعض آیاتِ قرآنی کا مفہوم غلط سمجھ لیا گیا۔ [۱۹]

وہ امور جن کی رعایت ضروری ہے

قرآن میں علومِ کائنات کی نسبت سے پانچ چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ انھیں بیان کیا جا رہا ہے:

اول: قرآن نے ان علومِ کائنات کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے، اس لیے کہ وہ مختلف قوانین کے تابع ہیں اور ان کی تفصیلات میں اتنی باریکی اور غموض ہے کہ وہ عوام کے فہم سے بالاتر ہیں۔ پھر یہ کہ قرآن کا عظیم تر مقصد یہ ہے کہ وہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو نجات دلانا اور اسے دنیا و آخرت کی سعادت سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے۔ (البقرۃ:۲، المائدۃ: ۱۵-۱۶) اس لیے مناسب نہیں کہ ہم ان حدود سے تجاوز کریں۔ وہ جب کائنات کی کسی چیز کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کا مقصد ہدایت اور مخلوق کو حق کی رہ نمائی ہوتا ہے، فلکیات، ہیئت، طبعیات اور دیگر سائنسی علوم کے حقائق بیان کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا۔

دوم: قرآن نے ان علوم کی طرف جو دعوت دی ہے وہ مظاہر کائنات میں غور وفکر اور دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کی چیزوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلِ انظُرُواْ مَاذَا فِيْ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ۔ (یونس:۱۰۱)	ان سے کہو ''زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو''۔
وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِيْ السَّمٰوٰتِ وَمَا فِيْ الْأَرْضِ جَمِيْعاً مِّنْهُ إِنَّ فِيْ ذَلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔ (الجاثیۃ:۱۳)	اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمھارے لیے مسخّر کر دیا۔ سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرنے والے ہیں۔

سوم: قرآن نے ان مظاہر کائنات کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اور اس کی مشیّت کے تابع ہیں۔ اس نے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو انھیں معبود اور تاثیر واقتدار کا مالک سمجھتے ہیں اور صراحت کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار کے تابع ہیں:

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِ۔ (فاطر:۴۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انھیں تھامنے والا نہیں ہے۔

چہارم: قرآن جب ہدایتِ الٰہی کے سیاق میں کائنات کی کسی نشانی کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کا بیان اس ذاتِ الٰہی کی طرف سے ہوتا ہے جو کائنات کے تمام علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور آسمانوں اور زمین کے تمام اسرار سے بہ خوبی واقف ہے اور جس سے زمین اور آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس چیز نے علوم کائنات سے دل چسپی رکھنے والے بعض لوگوں کو حیران اور ششدر کر دیا ہے، وہ حدِّ اعتدال سے آگے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے علومِ کائنات کو علومِ قرآن میں سے سمجھ لیا ہے۔

پنجم: قرآن نے کائنات کی نشانیوں کے بارے میں اظہار خیال کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بہترین اسلوب ہے۔ اس میں بہ یک وقت تفصیل بھی پائی جاتی ہے اور اجمال بھی۔ وہ ہر نسل اور ہر طرح کے انسانوں کو مخاطب کرتا ہے، ان کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ ہدایت اور اس کے دلائل پیش کرتا ہے اور جو کچھ بیان کرتا ہے، لوگ اپنی صلاحیتوں، دستیاب وسائل اور علوم وفنون کے مطابق کم وبیش اس کی جزئیات و تفاصیل اور دقائق سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔[۲۰]

میں سمجھتا ہوں کہ اس پہلو (یعنی کائنات اور انسان کے بارے میں سائنسی حقائق، جن کی طرف کتاب اللہ میں اشارے پائے جاتے ہیں) میں حقیقی اعجاز قرآن کے طرزِ تعبیر میں پایا جاتا ہے، یعنی ان امور میں جن کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا، نہ کہ اس چیز میں جسے ہم سائنسی تفسیر کا نام دیتے ہیں، اس لیے کہ اس میں غلطی اور صحت دونوں کا امکان رہتا ہے۔ قرآن نے ان حقائق کو اس انداز سے بیان کیا ہے جو تمام زمانوں میں لوگوں کی سمجھ میں آجانے والے ہیں، یعنی قرآن کا اسلوب، نظم اور بیان ان علمی وسائنسی حقائق کے اظہار میں اس حد تک وسیع ہوگیا ہے کہ کسی زمانے کے انسان کو خطاب کرنے سے عاجز نہیں رہا ہے اور اس سے وہ معانی نہیں نکالے گئے ہیں جن کا وہ متحمل نہ رہا ہو۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ دنیا کے کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس طرح ان چیزوں کو بیان کر سکے جس طرح قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں اس زمانے کے مطابق قرآن کو سمجھا گیا اور اس کی تفسیر کی گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں، جو سائنسی ایجادات و اکتشافات کا زمانہ ہے، ایک خاص انداز سے قرآن کو سمجھنے اور اس کی تفسیر و تشریح کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات اور انسان سے متعلق قرآنی اشارات کے سائنسی یا حقیقی مدلول کو سمجھنا تجربہ اور انسانی عمل پر موقوف ہے، جو زمانۂ نزولِ قرآن کے بعد کے زمانوں کا عمل ہے اور قرآن- جیسا کہ ہم جانتے ہیں- تمام زمانوں کے لیے ہے، یعنی اس کا مدار ان اشارات وظواہر کے ساتھ تعامل کے سلسلے میں قرآنی منہج کی تطبیق یا غور وفکر اور مشاہدہ وتجربہ کے قرآنی حکم کی تعمیل پر ہے۔[۲۱]

سائنسی تفسیر کے مؤیّدین اور مخالفین دونوں کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کے بعد ہم کہیں گے کہ سائنسی تفسیر کا نہ تو مطلق انکار صحیح ہے اور نہ اس کی مطلق تائید کو درست قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ دونوں حقیقتوں کو جمع کرنا مبنی برصواب رویّہ ہوگا، ایک قرآنی حقیقت جو یقینی نص کے ذریعے ثابت ہے اور دوسری سائنسی حقیقت جو قطعی تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعے پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے۔ اسی بنا پر تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کا کسی سائنسی حقیقت سے ٹکراؤ نہ کبھی پہلے ہوا ہے اور نہ کبھی آئندہ ہوگا۔ ٹکراؤ اس وقت ہوتا ہے جب سائنسی حقیقت اور قرآنی حقیقت میں سے کوئی ایک خود ساختہ ہو۔

سائنسی تفسیر کی بعض مثالیں

پہلی مثال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ۔ (الذاریات: ۴۷)

آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں جمال الدین الفندی نے لکھا ہے:

"یہ وسیع الاطراف مادی کائنات کروڑوں کہکشاؤں پر مشتمل ہے۔ ہر کہکشاں میں کروڑوں سورج اور ستارے ہیں اور ہر سورج یا ستارہ کے ماتحت بہت سے سیارے اور چاند ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں مختلف خصوصیات اور صلاحیتوں کی طاقتیں

(ENERGIES) اور شعاعیں (RAYS) ہیں، یہ تمام چیزیں خالق کائنات کی قدرت کے تابع ہیں۔ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابتداء میں جب کائنات پیدا کی تھی تو آسمان کو خوب وسیع کر دیا تھا، چنانچہ کہکشاؤں کے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود آسمان ان سب پر حاوی ہے۔

سائنسی پہلو سے دیکھا جائے تو کائنات کا حجم اب تک نہیں دریافت کیا جاسکا ہے۔ سائنس دانوں نے ستاروں کی چمک کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی ہے۔ جو ستارے ننگی آنکھ سے قبّۂ آسمان میں دکھائی دیتے ہیں اور جن میں مختلف درجات کی چمک پائی جاتی ہے، ان کی تعداد چھ ہزار سے زائد نہیں ہے، لیکن جب فلکیاتی دوربینوں سے دیکھا گیا تو ماہرینِ فلکیات نے بتایا کہ ہماری یہ کہکشاں ایک ٹکیہ کے مثل ہے۔ ہمارا سورج اس کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار شمسی سال کی دوری پر ہے۔ اس کا قطر تقریباً ایک لاکھ شمسی سال اور اس کی موٹائی تقریباً چھ ہزار شمسی سال کے برابر ہے'' ۔۲۲

دوسری مثال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِيْ لِأَجَلٍ مُسَمًّى أَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۔ (الزمر:۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اُسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخّر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقتِ مقرر تک چلا جارہا ہے۔ جان رکھو وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔

امام راغبؒ نے لکھا ہے: ''کَوَّرَ کے معنیٰ ہیں گھمانا اور لپیٹنا، جیسے عمامہ کو لپیٹا جاتا ہے۔ اس سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ سورج کی گردش سے رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے ہیں'' ۔۲۳

لسان العرب میں ہے: ''تکویر اللیل و النھار کا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ملا دیا جائے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رات اور دن میں سے ہر ایک کو دوسرے پر چڑھا دیا جائے۔ ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ

ایک کو دوسرے میں داخل کر دیا جائے۔ یہ تینوں معانی قریب قریب ہیں''۔۲۴

سید قطبؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''یہ عجیب وغریب تعبیر ہے، جو اس میں غور وفکر کرنے والے کو مجبور کرتی ہے کہ ان معلومات کی طرف رجوع کرے جو زمین کے گول ہونے سے متعلق ماضی قریب میں دریافت ہوئی ہیں۔ باوجود یہ کہ میں نے اس تفسیر میں پوری کوشش کی ہے کہ قرآن کو انسان کے دریافت کردہ نظریات پر محمول نہ کروں، اس لیے کہ یہ نظریات غلط بھی ہوسکتے ہیں اور صحیح بھی، آج اگر یہ صحیح معلوم ہورہے ہیں تو کل یہ غلط ثابت ہوسکتے ہیں، جب کہ قرآن برحق ہے، وہ بذات خود اپنی سچائی کی نشانی ہے، اس کی تائید وتصدیق کے لیے کم زور و ناتواں انسانوں کی تحقیقات و انکشافات کے حوالے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود یہ قرآنی تعبیر مجھے مجبور کررہی ہے کہ میں زمین کے گول ہونے سے متعلق معلومات میں غور کروں، اس سے ایک ایسی مادی حقیقت کی تصویر کشی ہوتی ہے جو روئے زمین پر قابل مشاہدہ ہے۔ گول زمین سورج کے سامنے اپنے محور پر گردش کررہی ہے، اس کی گول سطح کا جو حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے اس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو وہاں دن ہوتا ہے، لیکن یہ حصہ ایک حال پر قائم نہیں رہتا، اس لیے کہ زمین گردش کررہی ہے اور جوں جوں اس کی حرکت جاری رہتی ہے وہ سطح جس پر دن تھا، اس پر رات چھانے لگتی ہے۔ زمین کی یہ سطح برابر ڈھکی رہتی ہے، پہلے دن کی روشنی کے ذریعے، پھر رات کی تاریکی کے ذریعے، کچھ عرصہ کے بعد دوسرے گوشے سے پھر دن کا آغاز ہوتا ہے جو رات پر چھاجاتا ہے۔ یہ حرکت برابر جاری رہتی ہے۔ آیت یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّھَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی الَّیْلِ کے الفاظ سے شکل بھی نگاہ میں آجاتی ہے، مقام کی بھی تعیین ہوجاتی ہے اور زمین کی ماہیت اور اس کی حرکت کی نوعیت بھی طے ہوجاتی ہے۔ زمین کے گول ہونے اور اپنے محور پر گردش کرنے سے قرآنی تعبیر کی اچھی طرح وضاحت ہوجاتی ہے۔ یہ تفسیر کسی بھی دوسری تفسیر کے مقابلے میں، جسے اس نظریہ کی روشنی میں نہ کیا گیا ہو، زیادہ دقیق تفسیر ہے''۔۲۵

تیسری مثال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ۔(الحجر:۲۲) بارآور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں پہلے کے لوگ کہتے تھے کہ یہ تشبیہ ہے اس چیز کی کہ ٹھنڈی ہوائیں بادلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، جس سے بارش ہوتی ہے اور جانوروں کے نَر مادہ کو بارآور کرتے ہیں، یہاں تک کہ یورپ کے سائنس دانوں نے انکشاف کیا کہ ہوائیں بارآوری کا عمل براہ راست انجام دیتی ہیں۔ یہ بات زمانۂ نزول قرآن کے لوگوں کو نہیں معلوم تھی۔ وہ کھجور کی کاشت کے دوران عمل بارآوری اس طرح انجام دیتے تھے کہ اپنے ہاتھوں سے نر کھجوروں کے شگوفوں کو مادہ کھجوروں پر چھڑکتے تھے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بارآوری کا کام ہوائیں انجام دیتی ہیں، اسی وجہ سے قدیم مفسرین نے اس آیت سے یہ بات نہیں سمجھی تھی، بلکہ اسے مجاز پر محمول کیا تھا۔[۲۶]

چوتھی مثال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيْهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ۔ (الحجر:۱۹)

ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائیں۔

اس آیت میں لفظ 'موزون' (ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار) بہت دقیق اور عجیب و غریب تعبیر ہے۔ علم کیمیا (CHEMISTRY) اور علم نباتات (BOTANY) کے ماہرین نے ثابت کیا ہے کہ کوئی نبات جن عناصر پر مشتمل ہوتی ہے، ان میں سے ہر عنصر اس میں ایک متعین مقدار میں شامل ہوتا ہے۔ اس مقدار کا صحیح اندازہ ناپ تول کی دقیق ترین مشینوں سے، جن سے سینٹی گرام اور ملی گرام ناپا جاتا ہے، کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہر نبات میں یہ عناصر ایک خاص تناسب سے رہتے ہیں۔ آیت میں کل شیٔ (ہر چیز) کہا گیا ہے، جس میں انتہائی عموم پایا جاتا ہے اور اس کی صفت 'موزون' لائی گئی ہے۔ اس کے ذریعے ایسے فنّی سائنسی مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس دور سے قبل کسی انسان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے۔

حواشی ومراجع

۱ محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، ادارۃ القرآن والعلوم الإسلامیۃ، کراچی، پاکستان، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء، ۲/۴۷۴

۲ فہد الرومی، اتجاہات التفسیر فی القرن الرابع عشر الہجری، رئاسۃ إدارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والإرشاد، سعودی عرب، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۶ء، ۲/ ۵۴۹

۳ احمد عطا محمد عمر، الاتجاہ العلمی للتفسیر فی القرن العشرین، ایم اے ڈیزرٹیشن، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶-۱۹۹۷ء، ص ۱۰

۴ الشیخ زندانی، المعجزۃ العلمیۃ فی القرآن، بحوث مؤتمر الاعجاز العلمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

۵ مصطفیٰ صادق الرافعی، اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویۃ، مطبع وتاریخ طبع غیر مذکور، ص ۱۳۱

۶ محمد عبداللہ دراز، مدخل الی القرآن الکریم، دار القلم دمشق، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء، طبع دوم، ص ۱۷۶

۷ سید قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، طبع/ ۱۵، ۱/ ۱۸۲

۸ الشاطبی، الموافقات فی اصول الاحکام، تعلیق: محمد حسنین مخلوف، دار الفکر للطباعۃ والنشر، بیروت، ۲/ ۵۳

۹ ابوحیان الاندلسی، البحر المحیط، دار الفکر بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، طبع دوم، ۱/ ۳۴۱

۱۰ ملاحظہ کیجیے التفسیر والمفسرون، ۲/ ۴۹۲ و مابعد

۱۱ جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، تحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم، منشورات رضی، بیدار عزیزی، ۱۳۴۳ھ، طبع دوم، ۴/ ۳۰

۱۲ حوالہ سابق، ۴/ ۳۸-۴۰ بہ تصرف

۱۳ شمس الدین ابوعبداللہ محمد المعروف بابن قیم الجوزیۃ، کتاب الفوائد المشوّق الی علوم القرآن وعلم البیان، تحقیق: السید محمد بدرالدین النعسانی، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۸ھ، طبع اول، ص ۵

۱۴ حوالہ سابق، ص۶

۱۵ الشیخ مناّع القطان، مباحث فی علوم القرآن، مکتبۃ وہبۃ القاہرۃ، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء، طبع ہفتم، ص۳۸۳ (بہ تصرف)

۱۶ الطاہر بن عاشور، التحریر والتنویر، الدار التونسیۃ للنشر، ۱۹۸۴ء، ۱/ ۴۵

۱۷ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء، طبع اول، ۴/ ۱۶۶

۱۸ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی، ۴۹۸۱، عن أبی ہریرۃ

۱۹ ملاحظہ کیجیے مصطفیٰ مسلم، مباحث فی اعجاز القرآن، دار المنارۃ للنشر والتوزیع، جدۃ، سعودی عرب، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، طبع اول، ص۱۷۱، صلاح الخالدی، اعجاز القرآن البیانی، دار عمار للنشر والتوزیع، عمان، الاردن، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء، طبع اول، ص ۳۹۵

۲۰ الشیخ محمد عبدالعظیم الزرقانی، مناہل العرفان فی علوم القرآن، داراحیاء الکتب العربیۃ، عیسیٰ البابی الحلبی وشرکاؤہ، طبع سوم، سنہ طبع غیر مذکور، ۲/ ۲۵۰ (بہ تصرف)

۲۱ عدنان محمد زرزور، مدخل الی تفسیر القرآن وعلومہ، ص۲۳۴

۲۲ مصطفیٰ مسلم، مباحث فی اعجاز القرآن، ص۱۶۳، بہ حوالہ جمال الدین القندی، القرآن والعلم، ص۲۱۳ (بہ اختصار)

۲۳ الراغب الاصفہانی، معجم مفردات الفاظ القرآن، تحقیق: ندیم مرعشلی، دار الکتاب العربی، بیروت، ص۱۶۵

۲۴ ابن منظور، لسان العرب، ۵/ ۱۵۶

۲۵ سید قطب، فی ظلال القرآن، ۵/ ۳۰۳۸

۲۶ محمد رشید رضا، تفسیر القرآن الحکیم المعروف بتفسیر المنار، دار المعرفۃ بیروت، طبع دوم، ۱/ ۲۱۰

[سہ ماہی الدراسات الاسلامیۃ اسلام آباد، ج:۴۳، ش:۲، جولائی-ستمبر ۲۰۰۸ء]

☆☆☆

تفسیر مأثور اور تفسیر غیر مأثور پر ایک نظر
(۱)

پروفیسر احتشام احمد ندوی

تحقیقات اسلامی کے گزشتہ دو شماروں میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی کے مقالات شائع ہوئے ہیں۔ جنوری- مارچ ۲۰۱۰ء میں 'تفسیر ماثور' کے عنوان سے اور اپریل-جون ۲۰۱۰ء میں 'تفسیر غیر ماثور' کے عنوان سے۔ ان مقالات میں بعض پہلوؤں سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مضمون نگار سے بعض تسامحات سرزد ہوئے ہیں اور ان کے بعض خیالات الجھے ہوئے اور بعض گم راہ کن ہیں۔ آئندہ سطور میں ان پر مختصر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

تفسیر ماثور کے ضمن میں انھوں نے اسرائیلیات پر جو بحث کی ہے وہ مجمل ہے، اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان تفاسیر کی مکمل نشان دہی نہیں کی جو امت میں ماثور تفاسیر میں شمار ہوتی ہیں، نہ ان مفسرین کا ذکر کیا ہے جن کے اقوال ماثور تفاسیر میں بار بار ذکر کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر صحابہ اور تابعین ہیں اور ان کے اقوال کتب تفسیر میں ستاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں، البتہ چند تابعین ایسے ہیں جن کے تفسیری اقوال پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ 'تفسیر ماثور' کے عنوان سے فاضل مقالہ نگار کی پوری بحث کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ماثور تفسیری لٹریچر میں شبہات پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان تفاسیر کے تعارف میں، جو ماثور تفاسیر کی حیثیت سے معروف ہیں، بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ مثلاً تفسیرِ طبری تفسیر مأثور کی حیثیت سے معروف ہے، مگر روایات کے اعتبار سے طبریؒ حاطب اللیل

ہیں، اس کے برعکس ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں روایات کو چھان پھٹک کر لیا ہے، گو کہ ان سے بھی کہیں کہیں تسامح ہوا ہے۔ یہ فرق مضمون نگار نے نہیں بتایا ہے۔ ان دو تفسیروں کے علاوہ انھوں نے تفاسیر مأثور کے ضمن میں صرف ابن عطیہ کی المحرّر الوجیز، سیوطی کی الدرّ المنثور اور بغوی کی معالم التنزیل کے نام لیے ہیں، جب کہ ان کے علاوہ اور بھی ماثور تفسیریں اہمیت رکھتی ہیں اور معروف ہیں۔ ان کا تذکرہ کرنا چاہیے تھا۔

اپنے مقالہ 'تفسیر غیر ماثور' کی ابتدا میں پروفیسر اعظمی صاحب نے لکھا ہے:

> ''قرآن کی حکمت کا ایک بڑا حصہ آیات کے نظم و ترتیب میں چھپا ہے اور جب تک کافی غور و خوض نہ کیا جائے، ان کا فہم مشکل ہے۔ قرآن میں تدبر کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی ایک بڑی غرض ان ہی حکیمانہ معارف کی تعلیم ہے''۔ (ص ۳۹)

نظم قرآن کا یہ نظریہ اصلاً مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ہے، پروفیسر اعظمی ان کے متّبع ہیں۔ لیکن یہ بات اتنے عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے کہ معارفِ قرآنی کے حصول کا ذریعہ نظم قرآن میں تدبر ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو قرآن فہمی کے لیے نظمِ قرآن پر تدبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں تدبر اور نظم قرآن میں تدبر، دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں میں خلط ملط کرنا اور دونوں کی اہمیت پر یکساں زور دینا مناسب نہیں ہے۔ ماضی میں جو علماء اور مفسرین نظم قرآن کے قائل نہیں رہے ہیں انھوں نے بھی قرآن میں تدبر کیا ہے اور اس سے 'حکیمانہ معارف' کا استنباط کیا ہے۔

پروفیسر اعظمی نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''تفسیر ماثور میں کئی نقائص ہیں، اس بنا پر تفسیر ماثور کی صحت پر اصرار صحیح نہیں ہے۔ اس سے ہٹ کر تفسیر کرنا بالکل جائز ہے''۔
>
> (تحقیقاتِ اسلامی، اپریل- جون ۲۰۱۰ء، ص ۴۰)

ان کی یہ بات تو صحیح ہے کہ ''تفسیر مأثور سے ہٹ کر تفسیر کرنا جائز ہے''۔ امت کا اس پر عمل رہا ہے اور اب بھی ہے، لیکن مأثور تفاسیر میں نقائص بتا کر ان کو بالکلیہ

رد کرنا صحیح نہیں، ان تفاسیر کا بڑا حصہ لائقِ اعتماد اور قابل قبول ہے اور ان کو پوری امت کا اعتماد حاصل ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر قرطبی وغیرہ قابل رد ہیں۔ ان کے بغیر کوئی شخص صحیح طور پر نہ تفسیر لکھ سکتا ہے اور نہ قرآن کے مفاہیم کو سلفِ صالحین کے انداز پر سمجھ سکتا ہے۔

اعظمی صاحب کی یہ رائے صحیح ہے کہ ''اپنے مسلک و خیال کی تائید کرنے کے لیے تفسیر لکھنا تفسیر بالرائے ہے، فلاسفہ، معتزلہ، روافض، قرامطہ، صوفیہ اور اہل بدعت کی تفسیر کا شمار تفسیر بالرائے میں ہوتا ہے'' (ص۴۲)۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ امام قرطبیؒ کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن کو بھی تفسیر بالرائے میں شمار کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ ان کے بہ قول ''آیات سے زبردستی اپنے مذہب کے لیے دلائل فراہم کرتے ہیں'' (ص۴۴) یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ تفسیر قرطبی مأثور تفسیروں میں ممتاز اور نہایت معتبر ہے۔ امام رازیؒ کی تفسیر کبیر کو بھی پورے طور پر تفسیر بالرائے میں شمار کرنا درست نہیں۔ اس میں جو فلسفیانہ مباحث ہیں ان سے قطع نظر اس میں مسلکِ سلف کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امام رازیؒ نے آیات کی تفہیم کے لیے مضبوط دلائل پیش کیے ہیں۔ اس معاملے میں وہ پورے تفسیری ذخیرہ میں ممتاز ہے اور اس میں بڑا عمدہ تفسیری مواد ہے، جسے تفسیر ماثور میں شمار کرنا چاہیے۔

یوں تو پروفیسر اعظمی کے دونوں مقالات میں متعدد تسامحات پائے جاتے ہیں، جن میں سے کچھ کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا گیا، لیکن ان کی سب سے بڑی غلطی، جس کو ہمالیائی غلطی (HIMALIAN BLUNDER) کہا جاسکتا ہے، ان کی یہ عبارت ہے، جس پر انھوں نے اپنے مقالے کو ختم کیا ہے:

> ''یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر تفسیر کے دونوں طریقے ناقص ہیں تو پھر تفسیر کا صحیح اور کامل طریقہ کیا ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ تفسیر کا سب سے عمدہ اور مامون طریقہ تفسیر القرآن بالقرآن ہے''۔ (ص۵۳)

یہ بات بہ ظاہر صحیح ہے، لیکن اس کے ذریعے غلط استدلال کیا گیا ہے (کلمة

حق أرید به الباطل) یقیناً تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ ہے، لیکن اس کے ذریعے پورے قرآن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ تفسیر القرآن بالقرآن کا مطلب مفسرین کرام نے یہ بتایا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کی تفسیر دیگر آیات کی مدد سے کی جائے۔ قرآن کا بیان کہیں مجمل ہوتا ہے کہیں مفصل، کہیں ابہام پایا جاتا ہے تو کہیں اسے کھول دیا جاتا ہے، کہیں کوئی بات عمومی انداز میں کہی جاتی ہے کہیں اس میں تخصیص کردی جاتی ہے، کہیں کوئی بات مطلق کہی جاتی ہے کہیں اس میں کوئی قید لگادی جاتی ہے، اس لیے قرآن کے کسی حصے کی تفسیر لکھتے وقت اس سے متعلق دیگر مقامات کی آیات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، لیکن صرف اس اصول کو بنیاد بنا کر پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی جاسکتی، تفسیر لکھتے وقت تفسیر ماثور اور غیر ماثور دونوں سے استفادہ کرنا چاہیے، نہ کہ پورے ذخیرۂ تفسیر کو رد کردینا چاہیے۔ پروفیسر اعظمی کے نزدیک ماثور اور غیر ماثور تفسیری ذخیرہ دفترِ بے معنٰی ہے، قرآن کی نئی تفسیر 'تفسیر القرآن بالقرآن' کے اصول پر لکھنی چاہیے، یہ نہایت بے معنٰی اور مہمل نظریہ ہے۔ تفسیر قرآن کے لیے احادیث کے ذخیرہ کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا، سیرت رسول کے واقعات کو بھی دیکھنا ہوگا، تاریخ سے بھی مدد لینی ہوگی، پھر حسبِ موقع وضرورت تورات وانجیل سے بھی استفادہ کرنا ہوگا۔ 'قرآن کی تفسیر قرآن سے' ایک خوب صورت اور دل کش جملہ ہے، لیکن عملی لحاظ سے گم راہ کن ہے، اس کے ذریعے کوئی جامع تفسیر، جو عوام کے سامنے قرآن کے مطالب کو پیش کرسکے، نہیں لکھی جاسکتی۔

ہمارے لیے تفسیر غیر مأثور بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح تفسیر ماثور ضروری ہے۔ دونوں تفاسیر قرآن کے بارے میں ہمارے ذہن اور ہمارے افکار کو روشن کرتی ہیں۔ علامہ زمخشریؒ کی تفسیر الکشاف اور امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) دونوں کا شمار غیر ماثور تفسیر میں ہوتا ہے۔ آج کوئی شخص قرآن کی تفسیر کرنا چاہے تو ان دونوں تفسیروں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ البتہ اہل تشیّع اور اہل تصوّف کی تفاسیر میں کھینچ تان زیادہ کی گئی ہے، یہی حال معتزلہ کی تفاسیر کا ہے۔ ان سے اجتناب کرنا چاہیے کہ ان کا شمار تفسیر بالرائے مذموم میں کیا گیا ہے۔

پروفیسر الطاف اعظمی نے اپنے دونوں مقالوں کے آخر میں جو نتیجہ نکالا ہے کہ 'قرآن کی تفسیر صرف قرآن سے کرنی چاہیے' اس کا انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس سے انھوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ استنباط خود ان کا پیش کردہ اور یہ نتیجہ خود ان کا نکالا ہوا ہے، حالاں کہ یہ نظریہ اصلاً مولانا فراہیؒ کا پیش کردہ ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کے دونوں مقالوں کی بنیاد مولانا فراہی کے نظریات پر ہے اور ان میں مولانا فراہی کے خیالات سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ ''علامہ سید سلیمان ندوی فرمایا کرتے تھے: ''تجدّد اور تفرّد اسی حد تک جائز ہے جو علمائے سلفِ صالحین کے دائرے سے آگے نہ بڑھے۔ قرآن وحدیث سے جو سلفِ صالحین نے سمجھا ہے، اس سے تجاوز نہ کرنا چاہیے''۔

(۲)

جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف

پروفیسر الطاف احمد اعظمی کے قلم سے دو قسطوں میں (تحقیقات اسلامی جنوری-مارچ، اپریل-جون ۲۰۱۰ء) تفسیر ماثور و تفسیر غیر ماثور کے عنوانات کے تحت مقالات شائع ہوئے ہیں۔ مجلّہ کے مدیر محترم برادر مکرم مولانا سید جلال الدین عمری نے دونوں مقالوں پر اظہار رائے کی دعوت دی ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:

پروفیسر موصوف نے اپنے دوسرے مقالے کا خاتمہ اس جملے پر کیا ہے:

''تفسیر کا سب سے عمدہ اور مامون طریقہ تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔''

مگر انھوں نے دونوں مقالوں میں دیگر اقسام کی تفاسیر کی طرح جزوی ہی صحیح، تفسیر القرآن بالقرآن کی کوئی مثال نہیں پیش کی ہے کہ اس سے ہم اندازہ کر سکتے کہ یہ

'تفسیر القرآن بالقرآن' کیا ہوتی ہے؟ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے خود اپنے ہی قلم سے، تفسیر القرآن بالقرآن کے قائلین کے چہروں کو خوب بگاڑا اور بدنما کیا ہے۔ اپنے پہلے مقالے کی ابتداء میں انھوں نے لکھا ہے:

''تفسیر ماثور کا پہلا اصول تفسیر بالقرآن ہے۔ بلاشبہ یہ قرآن کی تفسیر کا سب سے عمدہ اصول ہے۔ لیکن افسوس کہ تفسیر ماثور کے قائل کسی مفسر نے اپنی تفسیر میں اس زرّیں اصول کی مکمل طور پر پیروی نہیں کی۔ جہاں انہیں آسانی کے ساتھ کوئی مماثل آیت مل گئی وہ درج کردی اور اس میں بھی اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ وہی آیات بطور نظائر پیش کی جائیں جن سے ان کے خیال اور مسلک کی تائید ہوتی ہو۔''

اس اقتباس میں پروفیسر موصوف نے دو جگہوں پر 'تفسیر ماثور' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ جب کہ تفسیر القرآن بالقرآن 'تفسیر ماثور' ہرگز نہیں ہے اور نہ تفسیر بالرائے ہے۔ وہ اپنے مضمون کی ابتداء میں تفسیر ماثور کی تعریف ان الفاظ میں کر چکے ہیں:

''تفسیری لٹریچر میں دو قسم کی تفسیریں ملتی ہیں۔ ایک وہ تفسیر ہے جس کی بنیاد روایت پر ہے۔ اس میں اقوال رسول (جو بہت کم ہیں) اور اقوال صحابہ و تابعین شامل ہیں۔ اس کو تفسیر ماثور یا تفسیر بالروایۃ کہا جاتا ہے''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہواً انہوں نے 'تفسیر کا پہلا اصول' لکھنے کے بجائے 'تفسیر ماثور کا پہلا اصول' لکھ دیا ہے، کیوں کہ تفسیر القرآن بالقرآن التفسیر بالروایۃ کا جز ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ تفسیر بالروایۃ اور تفسیر بالرائے کی طرح ایک مستقل بالذات طریقۂ تفسیر ہے جس کا نام تفسیر القرآن بالقرآن رکھا گیا ہے۔ اس طرح تفسیری لٹریچر میں دو نہیں، بلکہ تین طرح کی تفسیریں پائی جاتی ہیں۔

اسی ذیل میں انھوں نے آگے لکھا ہے:

''اصل بات یہ ہے کہ اس اصول کی پیروی نہایت مشکل تھی۔ کیوں کہ اس کے لئے قرآن میں ایک طویل مدت تک غور وفکر درکار تھا۔ ظاہر

ہے کہ جو مفسر بھی اس کا اہتمام و التزام کرتا وہ پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھ سکتا تھا اور ہر مفسر چاہتا تھا کہ وہ پورے قرآن کی تفسیر لکھے اور مفسر قرآن کہلائے۔ مذکورہ اصول کی پیروی میں ایک دشواری یہ بھی تھی کہ اکثر مفسرین کا دوسرے اسلامی علوم سے گہرا شغف اور اشتغال تھا۔ اس غیر معمولی مشغولیت کی وجہ سے قرآن میں تدبر کے لیے کافی وقت نکالنا مشکل تھا۔ ان ہی وجوہ سے تفسیر بالروایۃ کے طریقے کو ترجیح دی گئی۔''

اس اقتباس میں متعدد باتیں محل نظر ہیں۔ جہاں تک غور وفکر کی وجہ سے پورے قرآن کی تفسیر نہ لکھ سکنے کا تعلق ہے تو یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ اس کی ایک نا قابل تردید دلیل یہ ہے کہ تفسیر بالروایۃ کے مفسرین نے بے شمار روایات کو حفظ اور جمع کر کے انھیں اپنی تفسیروں میں درج کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں حفظ قرآن کا عام رواج تھا۔ ایک مفسر حافظ کے لئے مماثل آیات اپنے حفظ کی بنیاد پر جمع کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ عموماً وہی روایات درج کی گئی ہیں، جو ناقلین کے خیال ومسلک کے مطابق ہوتی تھیں، لیکن اکثر اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مخالفین کے دلائل کے تار و پود بکھیرنے کی طرف بھی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ پروفیسر موصوف کچھ تفاسیر بالقرآن کے نام دیتے اور ان سے مثالیں بھی پیش کرتے تو پورے وثوق سے بات کی جاسکتی تھی۔ اب تو یوں ہی خیال آرائی کرنی پڑے گی۔

قدیم مفسرین کا دیگر اسلامی علوم میں اشتغال ان کے سارے اوقات کو محیط نہیں ہوسکتا تھا اور نہ آج ہوتا ہے، اس لیے ناقص تفاسیر القرآن بالقرآن کی میرے نزدیک صحیح توجیہ یہ ہے کہ اس کے مفسرین علوم حدیث میں زیادہ دخل نہیں رکھتے تھے کہ حدیثوں (جن میں سنتیں بھی شامل ہیں) کی مدد سے اپنی تفسیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے، ورنہ دو چار مکمل تفسیروں کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ اس کے صحیح اسباب دریافت کرنے کی اب بھی ضرورت ہے۔

تفسیر قرآن کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ جہاں تک بن پڑے تفسیر القرآن

بالقرآن والسنۃ کے سنہری اصول کو اپنایا جائے اور سنت کو اس کے وسیع تر مفہوم میں لے کر اس میں احادیث صحیحہ کو بھی شامل کیا جائے۔ اس میں جانچ پڑتال، چھان بین اور احتیاط کی، اور ایک حد تک درایت کی بھی ضرورت ہے، لیکن خواہ مخواہ سارے یا بڑے ذخیرۂ احادیث سے صرف نظر کرنا کوئی عقل مندی کی علامت نہیں ہے۔ آج تو کمپیوٹر کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تحقیق کا کام بہت آسان ہوگیا ہے۔ البتہ ہم کو اپنے ملکہ فنِ حدیث کو پروان چڑھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔

انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالی نے نہ صرف ایک کتاب نازل کی، بلکہ اس کی حکمتوں اور اسرار کو سمجھانے کے لیے ایک معلم (Instructor) بھی روانہ کیا۔ اس لئے ہمیں نہ صرف کتابِ وحی کو تسلیم کرنا چاہیے، بلکہ اس کے ساتھ صاحب وحی اور مہبط وحی کو بھی ویسی ہی اہمیت دینی چاہیے اور اس کی تعلیم، شرح اور عملی تطبیق کو سرکاری کتاب (manual) کی عملی تفسیر تصور کرکے قبول کرنا چاہیے۔ اس سے سرکاری کتاب اور صاحب کتاب (یعنی کتاب لانے والے) دونوں کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

اس معاملے میں بعض لوگوں کو اِشکال محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی معلّمانہ حیثیت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ آپ کے قول وعمل کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح انسٹرکٹر کے بغیر کسی مینول کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس انسٹرکٹر (ﷺ) کے قول وعمل کی تاکید اور تحقیق ہر طرح سے کر لینی چاہیے، مگر جب وہ صحیح ثابت ہوجائے تو اس پر عمل پیرا ہونے میں تأمّل ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ رہے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے اقوال تو ان میں سے صرف ان کو اپنانا چاہیے جو صریح قرآن اور صریح حدیث صحیح سے نہ ٹکراتے ہوں، یا ان سے ایسے نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ نہ ہو جو شریعت کے پورے یا بعض مقاصد کو فوت کرنے کا سبب بن سکتے ہوں۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

اکلوتا فرزند ذبیح- اسحاقؑ یا اسماعیلؑ؟ عبدالستار غوری

ناشر: المورد، k-51، ماڈل ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۹ء، صفحات: ۳۲۳، قیمت: -/۳۳۰ روپے

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دو بیٹوں حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ میں سے کس کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا؟ اس پر صدیوں سے معرکہ آرا بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا اصرار ہے کہ وہ فرزندِ ابراہیم حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ مسلمانوں میں سے بھی بعض اہل علم اس کے قائل رہے ہیں، لیکن جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ شرف حضرت ابراہیم کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو، جو اپنے چھوٹے بھائی حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے قبل تک اکلوتے بھی تھے، حاصل ہوا تھا۔ بائبل میں فرزند ذبیح کے اکلوتے ہونے کی بھی صراحت ہے اور اس کا نام 'اسحاق' بھی درج ہے، جو کھلا ہوا تضاد ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہود نے حسب عادت اپنی مذہبی کتاب میں تحریف سے کام لیا ہے اور بنی اسماعیل کو، جن سے ان کی منافست اور چشمک رہتی تھی، اس شرف سے محروم کرنے کے لیے لفظ اسماعیل نکال کر اس کی جگہ اسحاق رکھ دیا ہے۔

اس موضوع پر متقدمین میں امام ابن تیمیہؒ نے اچھی بحث کی ہے۔ اور ماضی قریب میں مولانا حمیدالدین فراہی نے ایک مستقل رسالہ 'الرأی الصحیح فیمن ھو الذبیح؟' تصنیف کیا ہے، جس میں بائبل اور قرآن سے، حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے کی تیرہ تیرہ دلیلیں دی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں اس بحث و تحقیق کو آگے بڑھایا گیا ہے اور بائبل کے مختلف حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ ذبیح حقیقت میں اسحاقؑ نہیں، بلکہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔ کتاب گیارہ ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے، اس میں اکلوتے بیٹے، پہلوٹھے بیٹے، بیر سبع (زم زم) موریاہ (مروہ/ مقام قربانی)، مکہ/ بکہ اور حضرت ہاجرہ کے کنیز یا شہزادی ہونے کے حوالے سے خصوصی طور پر بحث کی گئی ہے اور

بائبل اور دیگر مستند حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہود کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ یہ کتاب اصلاً چند سال قبل انگریزی میں شائع ہوئی تھی، اسے علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ چنانچہ اب اس کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے، جو مصنف کے صاحب زادے احسان الرحمٰن غوری اور جناب عثمان سبحان غوری کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور مصنف نے بھی اس پر نظر ثانی کی ہے۔ یہ ترجمہ بھی اصل کی طرح معیاری اور مفید ہے۔ اس کے جملہ مباحث وہی ہیں جو اصل انگریزی کتاب میں تھے، البتہ ایک ضمیمہ جو 'متن بائبل میں تحریف کی چند صورتیں' کے عنوان سے تھا، اسے اردو ایڈیشن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ غالباً مصنف اس کو الگ کتاب کی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے 'یروشلم کی مختصر تاریخ' کے عنوان سے ایک ضمیمے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر کافی و شافی ہے اور یہود کی مغالطہ آمیزیوں کو بہت اچھی طرح طشت از بام کرتی ہے۔ اس اہم علمی خدمت پر مصنف اور مترجمین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن پر تحقیقات اسلامی (جولائی-ستمبر ۲۰۰۵ء) میں تبصرہ شائع ہوا تھا۔) (محمد جرجیس کریمی)

حدیث اور اس کے اصول وضوابط — مولانا عبدالخالق ندوی

ناشر: حاجی فیصل رحمٰن صدیقی، بینک کالونی، سول لائن، رام پور (یوپی)، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۶۴، قیمت -/۱۲۰ روپے

شریعت اسلامیہ کا دوسرا بنیادی ماخذ حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات میں لوگ براہ راست آپؐ سے استفادہ کرتے تھے، مگر آپؐ کے انتقال کے بعد آپؐ کے اقوال و افعال اور تقاریر (جنھیں احادیث کہا جاتا ہے) دو طریقوں سے امت میں منتقل ہوئیں۔ اولین مرحلے میں ان کا بڑا ذخیرہ زبانی روایت کے ذریعہ منتقل ہوا، پھر کتب میں ان کی تدوین ہوئی۔ احادیث روایت کرنے والے مختلف ذہنی سطح کے لوگ تھے۔ ان کے حافظہ اور فہم کے درجات متفاوت تھے۔ اس کے علاوہ زمان و مکان کے بُعد کی وجہ سے

بھی بعض مسائل پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے ضرورت محسوس کی گئی کہ احادیث کے اخذ و روایت کے سلسلے میں کچھ متعین اصول وضوابط وضع کیے جائیں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر محدثین نے احادیث پر صحیح، ضعیف، مرفوع، موقوف وغیرہ ہونے کا حکم لگایا۔ مزید یہ کہ راویوں کے بارے میں بھی مختلف حیثیتیں متعین کیں، جن سے ان کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب انہی اصول وضوابط سے بحث کرتی ہے۔

اس کتاب میں حدیث کی لغوی و اصطلاحی تعریفات، تدوین حدیث، کتب احادیث کی اقسام، محدثین کے طبقات اور مختلف اصطلاحات حدیث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ذریعے اردو خواں طبقہ خصوصاً طلبۂ حدیث کے لیے ایک رہ نما کتاب کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس کے مختلف مباحث کو ابواب وفصول میں تقسیم کرنے کے بجائے انھیں چند موٹے موٹے عنوانات کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔ کتاب کی زبان و بیان تدریسی ضرورت کے پیش نظر سہل اور معیاری ہے۔ عربی عبارتوں کے ترجمے دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مباحث فاضل مصنف نے شمالی ہند میں طالبات کی مشہور درس گاہ جامعۃ الصالحات رام پور کی بعض معلّمات کے سامنے بہ طور محاضرات پیش کیے تھے۔ محترمہ شمع انجم صالحاتی نے ان کی تدوین کر کے انھیں قابل اشاعت بنایا ہے۔ اس علمی خدمت پر مؤلف اور مرتبہ قابل مبارک باد ہیں۔ (م-ج)

مطالعات ومشاہدات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر: ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، رحمت نگر، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، صفحات: ۲۴۰، قیمت -/۲۵۰ روپے

دارالمصنفین کی علمی و ادبی خدمات اور اس سے وابستہ محققین کے علمی کارناموں کے تعارف وتذکرہ کے میدان میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا نام اور کام علمی حلقوں میں معروف ہے۔ غالباً ان کی اسی بے لوث خدمت کی وجہ سے اس ادارہ نے انھیں اپنا اعزازی رفیق بنالیا ہے۔ ان کی تصانیف: دارالمصنفین کی تاریخی خدمات،

متعلقات شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی بہ حیثیت مورخ، شاہ معین الدین ندوی- حیات و خدمات وغیرہ کو اہل علم نے پسندیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ سوانح نگاری کا انھیں خاص ملکہ ہے۔ ایسے مضامین کا ایک مجموعہ پہلے 'عظمت کے نشان' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اب انھوں نے یہ دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے۔

یہ کتاب تین قسم کے مضامین پر مشتمل ہے: علمی، تنقیدی اور وفیاتی۔ ان میں مختلف میدانوں کے ۲۸/ اصحاب کمال کا ذکر ہے، جو قرآن و حدیث، فقہ، شعر و ادب، تاریخ و تنقید، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، غرض مختلف علوم وفنون اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصنف نے ہر ایک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور اس کی خدمات کو نمایاں کیا ہے۔ مشہور شخصیات میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، قاضی اطہر مبارک پوریؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ، مولانا مجیب اللہ ندویؒ، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھیؒ اور پروفیسر نثار احمد فاروقیؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

ذکرِ شہباز — مولانا محمد اسماعیل فلاحی

ناشر: حرم فاؤنڈیشن، لکھنؤ، (یوپی) ۲۰۰۹ء، صفحات: ۴۲۴، قیمت -/۱۸۰ روپے

مولانا شہباز اصلاحیؒ (م ۲۰۰۲ء) تحریک اسلامی ہند کی ایک قدر آور شخصیت تھے۔ انھوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ سے فراغت کے بعد سیوان، بھاگل پور، جامعہ کاشف العلوم ہزاری باغ، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ، جامعہ اسلامیہ بھٹکل اور آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

جہاں رہے وہاں خلقِ کثیر کو فیض پہنچایا اور اپنے وابستگان ومنتسبین کا بڑا حلقہ چھوڑا۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی شاگردی کے نتیجے میں قرآن پر ان کی گہری نظر تھی۔ مدارس میں عموماً قرآن کی گھنٹیاں ان سے متعلق کی جاتی تھیں۔ ان کے دروس معارف وحِکَم کا خزینہ ہوتے تھے۔ راقم سطور کو بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کئی سال ان سے قرآن پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اوقاتِ تعلیم کے علاوہ بھی طلبہ انھیں ہروقت گھیرے رہتے تھے اور وہ مختلف علوم وفنون میں ان کی مشکلیں حل کرتے رہتے تھے۔ تحریکی اعتبار سے بھی ان کی شخصیت بڑی متحرک اور فعّال تھی۔ وہ پابندی سے اجتماعات میں شریک ہوتے، دوسروں کو شرکت پر آمادہ کرتے اور دعوتی مقصد سے لمبی لمبی مسافتیں پیدل طے کرتے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان کے برادر زادہ مولانا محمد اسماعیل فلاحی استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کو کہ انھوں نے ان کا ذکرِ جمیل زیرِ نظر مجموعۂ مضامین میں یکجا کر دیا ہے۔

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 'کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مولانا مرحوم کی حیات اور خدمات پر معروف اصحاب قلم کے مضامین شامل ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل فلاحی نے تفصیل سے ان کے احوال زندگی، تدریسی وتحریکی سرگرمیوں، اخلاق واوصاف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، ادب اور تعلیم وتربیت کے موضوع پر ان کے علمی نکات کو جمع کیا ہے۔ جناب عبدالمتین منیری نے ان کے قیامِ بھٹکل کی یادیں تازہ کی ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اساتذہ نے ان کی تدریسی خدمات، انداز تعلیم وتربیت، علم وفضل اور اخلاق وکردار کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان لکھنے والوں میں مولانا محمد ایوب اصلاحی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا عمر اسلم اصلاحی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی، مولانا امین الدین شجاع الدین ندوی اور مولانا سید سلمان حسینی ندوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرے حصے میں مولانا کے نام چند مکاتیب ہیں۔ان میں جناب میاں طفیل محمدؒ (پاکستان) اور جناب افضل حسینؒ (سابق قیم جماعت اسلامی ہند) کے مکاتیب جماعتی مسائل پر اور قاری علی محمدؒ کا مکتوب معروف بزرگ شاہ وصی اللہؒ سے بیعت سے متعلق ہے۔ تیسرے حصے میں مولانا کی چند تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ ان میں وہ مضامین بڑے اہم ہیں جو ماہ نامہ زندگی رام پور میں مقالہ یا اداریہ کی صورت میں شائع ہوئے تھے۔

آخری حصہ مولانا مرحوم کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر مکاتیب ان کے قریبی رشتہ داروں (والد، بھائیوں، بھتیجوں، اہلیہ وغیرہ) اور چند دوسروں کے نام ہیں۔ یوں تو یہ برجستہ لکھے گئے ہیں، لیکن ان میں علم ومعرفت کے گوہرِ آب دار پنہاں ہیں، قرآن کریم کے اسرار ورموز کھولے گئے ہیں، ایمان ویقین، صبر ورضا، توکل وللّٰہیت کی باتیں ہیں۔ بلاتکلّف کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔

فاضل مرتب شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مرحوم مولانا شہباز اصلاحی کی حیات اور علمی خدمات پر اتنا خوب صورت اور قابل قدر مجموعہ مرتب کیا۔ یہ اس لائق ہے کہ مدارس و جامعات کے اساتذہ اور طلبہ اور جماعتوں کے ارکان و وابستگان اس کا مطالعہ کریں اور اس روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنواریں۔ (م-ر)

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۳۷)

☆ صدر ادارہ و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی مشہور تصنیف 'اسلام کی دعوت' اردو زبان میں دعوت کے موضوع پر مقبول و مؤثر کتابوں میں سے ہے۔ اب تک اس کے نو ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اب اس کا دسواں ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی سے بائبل پیپر پر خوب صورت طباعت اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ صفحات: ۳۴۴، قیمت مجلد -/۱۴۰ روپے۔

☆ مولانا عمری کا ایک مقبول کتابچہ 'خدا کی غلامی انسان کی معراج' کے نام سے ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ حال میں اس کا نیا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے۔ صفحات: ۳۶، قیمت: -/۱۴ روپے۔

☆ مولانا عمری کا سفرنامۂ حج 'سوئے حرم چلا' کے نام سے کئی سال قبل شائع ہوا تھا۔ حج سے متعلق مختصر سفرناموں میں یہ ایک مؤثر سفرنامہ ہے۔ اس سے حج کی ترغیب بھی ہوتی ہے اور اس کے احکام کا بھی مختصر علم ہو جاتا ہے۔ اردو میں اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اب مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی نے اس کا ہندی ترجمہ 'کعبے کا سفر' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ صفحات: ۶۴

☆ ادارہ کے توسیعی خطبات پروگرام کے تحت ۸/اگست ۲۰۱۰ء کو معروف سائنٹسٹ ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی، سابق مدیر سہ ماہی 'آیات' ورکن سینٹر فار اسٹڈیز آن سائنس علی گڑھ نے 'فلسفہ، سائنس اور قرآن' کے موضوع پر لکچر دیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر مسعود احمد، شعبۂ بایوکیمسٹری، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے کی۔ یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں سے وابستہ اساتذہ، طلبہ اور دیگر اہل علم نے شرکت کی اور بحث ومذاکرہ میں حصہ لیا۔

☆ ادارہ کا تصنیفی تربیت پروگرام کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ اس کے تحت دینی مدارس اور عصری جامعات کے نوخیز فارغین کو اسلامی علوم میں تحقیق وتصنیف کی تربیت دی جاتی ہے۔ ۲۶/ستمبر ۲۰۱۰ء کو ایک انٹرویو کے بعد اس شعبہ میں ایک نئے اسکالر کا اضافہ کیا گیا ہے۔

☆ اراکین ادارہ اپنے علمی و تصنیفی کاموں کے ساتھ بسا اوقات کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کرتے ہیں۔ ۲۷-۲۸ ستمبر ۲۰۱۰ء کو بنگلور میں قائم مشہور آشرم Art of Living کے زیر انتظام H.I.V./AIDS پر کام کرنے والی متعدد قومی اور بین الاقوامی تنظیموں کی شراکت سے ایک بین الاقوامی کانفرنس Faith in Action Summit 2010 کے عنوان سے منعقد ہوئی، جس میں ملک و بیرون ملک کے تقریباً پانچ سو مختلف مذاہب کی نمائندہ شخصیات شریک ہوئیں اور H.I.V./AIDS کے متاثرین کے مسائل اور ان کے خلاف نفرت و تفریق کے جذبات کے خاتمے پر غور و خوض کیا۔ رکن ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے اس میں شرکت کی اور پروگرام کے دوران گروپ ڈسکشن میں حصہ لیا۔ اس موقع پر تمام مذاہب کے نمائندوں کی منظوری سے ایک اعلامیہ بھی جاری کیا گیا۔

☆ تحقیقات اسلامی کی ویب سائٹ www.tahqeeqat.net کے نام سے کام کر رہی ہے۔ اب تک اس پر صرف مجلّہ کے قدیم شمارے اپ لوڈ کیے گئے تھے۔ اب ادارہ کے ایک بہی خواہ جناب محمد عرفان (جدہ) نے اس کی خوب صورت ڈیزائننگ کر دی ہے اور اس میں مجلّہ اور ادارہ کا تعارف (اردو، عربی اور انگریزی میں) ادارتی و انتظامی معاملات کے لیے رابطہ کا پتا، موبائل نمبر و ای میل، زر تعاون کی تفصیل اور Feed back وغیرہ کے کالمس کا اضافہ کر دیا ہے۔ اہل ذوق سے اس کی وزٹ کرنے اور اسے بہتر بنانے کے سلسلے میں مشوروں سے نوازنے کی درخواست ہے۔

☆ ادارہ الحمد للہ اپنے وسیع و عریض کیمپس میں ہمہ جہت ارتقاء و استحکام کی جدو جہد میں مصروف ہے۔ چنانچہ گزشتہ دو سالوں میں ایک طرف ارکان ادارہ نے تین اہم موضوعات پر علمی و تصنیفی کام مکمل کیا ہے، دوسری طرف بعض اصحاب خیر کے خصوصی تعاون سے ادارہ کی بالائی منزل کی تعمیر کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا ہے، تیسری طرف ادارہ کے کیمپس میں آمد و رفت کی سہولت، شجر کاری اور مجموعی طور سے اس کی تزئین و آرائش کے اقدامات کیے گئے ہیں۔ اصحاب خیر مزید تعاون فرمائیں تو بقیہ تشنۂ تکمیل کاموں کو بھی جلد پورا کیا جا سکے گا۔

فہرست مضامین سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ، جلد ۲۹، ۲۰۱۰ء

مضامین	مضمون نگاران	شمارہ	صفحات
حرف آغاز			
خاندانی نظام اور قرآنی تعلیمات	سید جلال الدین عمری	۱	۵-۲۳
اقامت دین	،،	۲	۱۲۵-۱۳۴
مکالمہ بین المذاہب	،،	۳	۲۴۵-۲۵۵
اسوۂ ابراہیمی	،،	۴	۳۶۵-۳۷۶
تحقیق وتنقید			
شاہ ولی اللہ کا نظریۂ عدل	ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی	۱	۲۵-۴۲
نبوت محمدی کی آفاقیت- آغاز، اعلان اور تعین	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۲	۱۳۵-۱۵۸
تفسیر منہج الصادقین- ایک مطالعہ (۱)	پروفیسر کبیر احمد جائسی	۳	۲۵۷-۲۸۰
،، ،، (۲)	،،	۴	۳۷۷-۳۹۰
علوم اسلامیہ کی اشاعت میں ہندوستانی مدارس کا کردار	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	۴	۳۹۱-۴۱۶
بحث ونظر			
تفسیر ماثور	پروفیسر الطاف احمد اعظمی	۱	۴۳-۵۶
تفسیر غیر ماثور	،،	۲	۱۵۹-۱۷۵
چند مسائل فقہ کا مطالعہ- منتخب مجموعہ ہائے فتاویٰ کی روشنی میں	ڈاکٹر علی اصغر شاہد	۲	۱۷۷-۲۰۲
اسلام دین فطرت	مولانا محمد جرجیس کریمی	۳	۲۸۱-۳۰۴
اسلامی تہذیب کا دائرہ کار اور دیگر تہذیبوں پر اس کے اثرات	ڈاکٹر عمر حیات	۳	۳۰۵-۳۱۸
صحابیات اور علم کی تحصیل واشاعت	ڈاکٹر زاہدہ شبنم	۴	۴۱۷-۴۳۶
سیر وسوانح			
شیخ علی طنطاوی کی 'ذکریات'- مطالعہ وتجزیہ	ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی	۱	۵۷-۸۲
سیرت نگاری میں امام حلبیؒ کا مقام	جناب نوید احمد شہزاد	۲	۲۰۳-۲۱۶
ترجمہ وتلخیص			
مسئلہ تصویر کے مختلف پہلو اور علماء کے اجتہادی افکار	ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی	۱	۸۳-۱۰۴

قرآن کریم کا سائنسی اعجاز	ڈاکٹر محمد عبدالتواب حامد مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۴	۴۳۷-۴۶۰

نقد و استدراک

نظم قرآن، مولانا فراہی اور مولانا مودودیؒ	پروفیسر احتشام احمد ندوی	۱	۱۰۵-۱۰۸
نور محمدی کا دینی و تاریخی استناد	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۳	۳۱۹-۳۳۶
تفسیر ماثور اور تفسیر غیر ماثور پر ایک نظر	پروفیسر سید احتشام احمد ندوی	۴	۴۶۱-۴۶۵
	جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف	۴	۴۶۵-۴۶۸

تعارف و تبصرہ

مقاصد شریعت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۱۰۹-۱۱۳
اسلام کا خاندانی نظام	،،	۱	۱۱۴-۱۱۵
ذلک الکتاب	مولانا مقصود حسین عمری	۱	۱۱۵-۱۱۶
مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی نظریات	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	۱	۱۱۶-۱۱۷
سرمۂ اعتبار	مولانا انیس الرحمٰن ندوی	۱	۱۱۸-×
قرآن میں آبی وسائل کا علم اور انجینیری	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۲۱۷-۲۲۶
بدایۃ المجتہد (اردو ترجمہ)	مولانا بشیر احمد اصلاحی	۲	۲۲۷-۲۳۳
تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس پر نقد و بحث	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲	۲۳۳-۲۳۴
اردو میں مرثیہ نگاری کا فنّی ارتقاء	ڈاکٹر محمد شہاب الدین	۲	۲۳۴-۲۳۶
فروغ نوا (مجموعۂ نعت)	جناب محمد نظام الدین	۲	۲۳۶-۲۳۸
اسلام- دین اعتدال	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۲۳۸-×
ترجمات معانی القرآن الانجلیزیۃ (عربی)	،،	۳	۳۳۷-۳۴۳
رہبر انسانیت	پروفیسر احتشام احمد ندوی	۳	۳۴۳-۳۴۶
عہد اسلامی کے ہندوستان میں معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر اقتدار حسین صدیقی	۳	۳۴۶-۳۵۵
اردو میں حج کے سفر نامے	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۳	۳۵۶-۳۵۷
اکلوتا فرزند ذبیح، اسماعیلؑ یا اسحاقؑ	مولانا محمد جرجیس کریمی	۴	۴۶۹-۴۷۰
حدیث اور اس کے اصول و ضوابط	،،	۴	۴۷۰-۴۷۱
مطالعات و مشاہدات	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۴	۴۷۱-۴۷۲
ذکر شہباز	،،	۴	۴۷۲-۴۷۴
خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی	(۳۴) ادارہ	۱	۱۱۱۹-۱۲۰
،، ،،	(۳۵) ،،	۲	۲۳۹-۲۴۰
،، ،،	(۳۶) ،،	۳	۳۵۸-۳۶۰
،، ،،	(۳۷) ،،	۴	۴۷۵-۴۷۶

فہرست مضمون نگاران سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جلد ۲۹، ۲۰۱۰ء

مضمون نگاران	مضامین	شمارہ	صفحات
اصلاحی، بشیر احمد	بدایۃ المجتہد (اردو ترجمہ) (تبصرہ)	۲	۲۲۷-۲۳۳
اصلاحی، صفدر سلطان	شیخ علی طنطاوی کی 'ذکریات'-مطالعۂ تجزیہ	۱	۵۷-۸۲
اعظمی، الطاف احمد	تفسیر ماثور	۱	۴۳-۵۶
،،	تفسیر غیر ماثور	۲	۱۵۹-۱۷۵
الہ آبادی، محمود حسن	مسئلہ تصویر کے مختلف پہلو اور علماء کے اجتہادی افکار	۱	۸۳-۱۰۴
جائسی، کبیر احمد	تفسیر منہج الصادقین- ایک مطالعہ (۱)	۳	۲۵۷-۲۸۰
،،	،، ،، (۲)	۴	۳۷۷-۳۹۰
حامد، محمد عبدالتواب	قرآن کا سائنسی اعجاز	۴	۴۳۷-۴۶۰
زاہدہ شبنم	صحابیات اور علم کی تحصیل واشاعت	۴	۴۱۷-۴۳۶
شاہد، علی اصغر	چند مسائل فقہ کا مطالعہ-منتخب مجموعہ ہائے فتاوی کی روشنی میں	۲	۱۷۷-۲۰۲
شہاب الدین، محمد	اردو میں مرثیہ نگاری کا فنی ارتقاء (تبصرہ)	۲	۲۳۴-۲۳۶
شہزاد، نوید احمد	سیرت نگاری میں امام حلبیؒ کا مقام	۲	۲۰۳-۲۱۶
صدیقی، اقتدار حسین	عہد اسلامی کے ہندوستان میں معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل (تبصرہ)	۳	۳۴۶-۳۵۵
صدیقی، محمد یٰسین مظہر	نبوت محمدی کی آفاقیت-آغاز، اعلان اور تعین	۲	۱۳۵-۱۵۸
،،	نور محمدی کا دینی و تاریخی استناد	۳	۳۱۹-۳۳۶
عمر حیات	اسلامی تہذیب کا دائرہ کار اور دیگر تہذیبوں پر اس کے اثرات	۳	۳۰۵-۳۱۸
عمری، سید جلال الدین	اسوۂ ابراہیمی	۴	۳۶۵-۳۷۶
،،	اقامت دین	۲	۱۲۵-۱۳۴
،،	خاندانی نظام اور قرآنی تعلیمات	۱	۵-۲۳
،،	مکالمہ بین المذاہب	۳	۲۴۵-۲۵۵

عمری، مقصود حسین	ذلک الکتاب (تبصرہ)	۱	۱۱۵-۱۱۶
فلاحی، احسان اللہ فہد	شاہ ولی اللہؒ کا نظریۂ عدل	۱	۲۵-۴۲
قاسمی، محمد شمیم اختر	علوم اسلامیہ کی اشاعت میں ہندوستانی مدارس کا کردار	۴	۳۹۱-۴۱۶
،،	مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی نظریات (تبصرہ)	۱	۱۱۶-۱۱۷
الکاف، سید حامد عبدالرحمٰن	تفسیر ماثور اور تفسیر غیر ماثور پر ایک نظر	۴	۴۶۵-۴۶۸
کریمی، محمد جرجیس	اسلام-دین فطرت	۳	۲۸۱-۳۰۴
،،	اکلوتا فرزند ذبیح، اسماعیلؑ یا اسحاقؑ؟ (تبصرہ)	۴	۴۷۱-۴۷۲
،،	تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس پر نقد و بحث (،،)	۲	۲۳۳-۲۳۴
،،	حدیث اور اس کے اصول وضوابط (،،)	۴	۴۷۳-۴۷۴
ندوی، احتشام احمد	تفسیر ماثور اور تفسیر غیر ماثور پر ایک نظر	۴	۴۶۱-۴۶۵
،،	رہبر انسانیت (تبصرہ)	۳	۳۴۳-۳۴۶
،،	نظم قرآن، مولانا فراہی اور مولانا مودودی	۱	۱۰۵-۱۰۸
ندوی، انیس الرحمٰن	سرمۂ اعتبار (تبصرہ)	۱	۱۱۸-x
ندوی، محمد رضی الاسلام	اردو میں حج کے سفرنامے (تبصرہ)	۳	۳۵۶-۳۵۷
،،	اسلام-دین اعتدال (،،)	۲	۲۳۸-x
،،	اسلام کا خاندانی نظام (،،)	۱	۱۱۴-۱۱۵
،،	ترجمات معانی القرآن الانجلیزیۃ (عربی) (،،)	۳	۳۳۷-۳۴۳
،،	ذکر شہباز (،،)	۴	۴۷۲-۴۷۴
،،	قرآن کریم کا سائنسی اعجاز (ترجمہ)	۴	۴۳۷-۴۶۰
،،	قرآن میں آبی وسائل کا علم اور انجینیری (تبصرہ)	۲	۲۱۷-۲۲۶
،،	مطالعات و مشاہدات (،،)	۴	۴۷۱-۴۷۲
،،	مقاصد شریعت (،،)	۴	۱۰۹-۱۱۳
نظام الدین، محمد	فروغ نوا (مجموعۂ نعت) (،،)	۲	۲۳۶-۲۳۸

ارکانِ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی

چند اہم مطبوعات

گھریلو تشدّد اور اسلام — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

گھریلو تشدّد (Domestic Violence) نے عالمی سطح پر سنگین صورت حال اختیار کرلی ہے اور دنیا کے تمام ممالک میں عورتیں اس کا شکار ہیں۔ اس کتاب میں اعداد وشمار کی روشنی میں اس مسئلہ کی سنگینی کا جائزہ لینے کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیے کیا تدابیر اختیار کی ہیں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی کیا تاکیدی ہدایات دی ہیں۔ صفحات: ۸۰، قیمت: -/۳۰ روپے

حضرت ابراہیم علیہ السلام — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ، دعوتی جدّ و جہد، اوصاف حسنہ، ملت ابراہیمی کے ترکیبی عناصر اور اسلام سے اس کے تعلق پر قرآن کریم کی روشنی میں ایک علمی وتحقیقی مطالعہ۔
صفحات: ۲۰۰، قیمت: -/۶۰ روپے

جرائم اور اسلام — مولانا محمد جرجیس کریمی

موجودہ دور میں جرائم عالم انسانیت کا سب سے سنگین مسئلہ ہے اور ہزار کوششوں کے باوجود ان پر قابو پانے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہورہی ہیں۔ اس کتاب میں جرائم کے اسباب، اثرات اور ان کے انسداد میں موجودہ انسانی قوانین کی ناکامی سے بحث کرنے کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے جرم وسزا کا کیا تصور پیش کیا ہے؟ اسلامی اقدار وتعلیمات سے جرائم کا انسداد کیوں کر ممکن ہے؟ اور ان کے ارتکاب کی صورت میں اسلام نے ان کے علاج کی کیا صورتیں تجویز کی ہیں؟ وقت کے ایک اہم موضوع پر ایک علمی وتحقیقی کتاب۔ صفحات: ۲۲۴، قیمت: -/۸۵ روپے

مسلمانوں کی حقیقی تصویر — مولانا محمد جرجیس کریمی

اس کتاب میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مسلمانوں کی ایسی حقیقی اور تاب ناک تصویر پیش کی گئی ہے جس سے ان کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ صفحات: ۱۶۴، قیمت: -/۵۵ روپے

ملنے کے پتے: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵